معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے — فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر
بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیٰ، شیرستان بلڈنگ
بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۱ ماہ صفر المظفر، ربیع الاول ۱۴۲۴ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۰۳ء عدد ۵

فہرست مضامین

شذرات

انسان کی خواہش کے خلاف جب کوئی کام ہوتا ہے تو اسے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور وہ بہت پست ہمت اور بددل ہو جاتا ہے، اس وقت دنیا میں جو حوادث مسلسل رونما ہو رہے ہیں وہ بدقسمتی سے مسلمانوں کی توقع کے مطابق نہیں ہو رہے ہیں، اس لیے وہ سخت افسردہ ہیں، فلسطین، چیچنیا، افغانستان اور عراق میں ہونے والی تباہی پر کس مسلمان کی آنکھوں سے آنسو نہ ٹپکے ہوں گے اور کس کا دل نہ تڑپا ہوگا بلکہ سینہ افلاک سے بھی آہ سوزناک اٹھی ہوگی

ع   آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

یہ واقعات ہماری توقع اور خواہش کے خلاف اور ہمارے لیے سخت جاں گسل اور ولولہ شکن ہیں مگر قانون فطرت کے مطابق ہیں، مسلمانوں کی اصل دولت ایمان و عملِ صالح ہے جو ان کے ان قدرتی ذخائر، معدنیات اور پٹرول کے کنوؤں سے بیش قیمت ہے جن پر تسلط اور اسرائیل کے تحفظ کے لیے امریکہ اور برطانیہ نے عراق پر حملہ کیا تھا، لیکن مسلمان ایمان کی دولت اور اخلاق و کردار کی متاع کب سے گنوائے بیٹھے ہیں تو خدا کی نصرت اور مدد کے کس طرح مستحق ہوں گے، مادی طاقت فراہم کرنے کی قرآن نے تاکید کی ہے، لیکن یہ سرمایہ بھی ان کے پاس نہیں رہا، انہیں اپنے عیش و تنعم اور طاؤس و رباب سے فرصت کہاں کہ شمشیر و سناں کے خوگر بنیں، اب جن ہتھیاروں سے جنگیں ہوتی ہیں وہ علم و سائنس میں برتر اقوام کے پاس ہیں، مسلمانوں کے اسلاف کی یہ میراث مدت ہوئی تثلیث کے فرزندوں نے ان سے چھین لی ہے، وہی عراق جو اپنے برادر ملک سے برسوں سامراجی طاقتوں کے اشارے پر لڑکر اپنے کیمیاوی ہتھیار برباد کر چکا تھا، پچیس روز تک بھی مزاحمت نہ کر سکا برادرانہ جنگوں اور معاشی و سیاسی پابندیوں نے اسے بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔

مسلم ممالک کے عدم اتفاق نے ان کی ساکھ ختم کر دی ہے اور ان کے باہمی جنگ و جدال نے انہیں ایسا پراگندہ کر دیا ہے کہ معمولی ہوا کا جھونکا بھی لکڑی کے ان کندوں کو زمیں بوس کرنے کے لیے کافی ہے، اس لیے عراق و افغانستان کی ہزیمت و پسپائی مسلمانوں کے لیے تکلیف دہ تو ہے لیکن یہ ان کے حالات کا عین اقتضا ہے، ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کے بجائے بیدار اور متنبہ ہونا

چاہیے، زندہ قومیں تخریب ہی میں تعمیر کی راہیں ڈھونڈ لیتی ہیں اور اپنی کھوئی ہوئی دولت و قوت دوبارہ اکٹھی کر کے ناموافق حالات کو اپنے موافق بنا لیتی ہیں، بہ ظاہر تو امریکہ و برطانیہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے مگر یہیں سے ان کی شکست کا آغاز بھی ہو سکتا ہے، ان کی ذلت و رسوائی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ ان کے خلاف ہر ملک میں ہنگامے ہو رہے ہیں، مسلم ممالک ہی نہیں یورپ کے ملکوں اور خود امریکہ اور برطانیہ میں بھی ان کی شدید مذمت کی جا رہی ہے اور بلا امتیاز ہر قوم و مذہب کے لوگ ان پر لعنت بھیج رہے ہیں، ہندوستان میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں اور دوسری قوموں نے احتجاج، مظاہرے اور جلسے جلوس کیے، جن لوگوں کو اپنے خیال کے مطابق امریکہ نے صدام کے ظلم و جبر سے آزادی دلائی تھی وہ بھی اس کے خلاف سڑکوں پر آ گئے ہیں، اسے شیعوں کی ہمدردی بھی حاصل نہیں، شیعہ بھی امریکہ کے نوآبادیاتی نظام تھوپنے اور اس کے ذریعہ قایم کی جانے والی حکومت کو تسلیم نہیں کر رہے ہیں۔

حسب معمول دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ کا سالانہ جلسہ ۲۸/اپریل ۲۰۰۳ء کو ہوا، اکیڈمی کے مالی سال کا اختتام مارچ میں اور آغاز اپریل میں ہوتا ہے، اس بنا پر اسی مہینے میں جلسے کا انعقاد مناسب بھی ہے تاکہ فاضل ارکان اکیڈمی کے مختلف شعبوں کی گزشتہ سال کی کارگزاری اور آمدنی اور اخراجات سے واقف ہو سکیں اور آیندہ سال کے بجٹ کی منظوری دے سکیں، مگر ادھر کئی برسوں سے اپریل میں موسم زیادہ سخت ہو جاتا ہے، اس کی وجہ سے بعض ارکان خواہش کے باوجود تشریف نہیں لاتے، جو ارکان تشریف لاتے ہیں ان کو بھی سخت زحمت ہوتی ہے، اس دفعہ مولانا محمد سعید مجددی کو بھوپال سے اور مرزا امتیاز بیگ کو علی گڑھ سے تشریف لانے میں بڑی مشقت اٹھانی پڑی، مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی کو قلب کی تکلیف تھی، اللہ تعالیٰ انہیں شفائے کلی عطا فرمائے وہ ابوظبی سے دارالمصنفین سے تعلق اور اخلاص کی بنا پر تشریف لائے تھے، ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام بھی علی گڑھ سے اور ڈاکٹر سلمان سلطان صاحب یہیں سے رونق افروز ہوئے تھے، ان سب حضرات نے بڑی ہمدردی اور دل سوزی سے دارالمصنفین کے مسایل پر غور کیا اور حالات کے بہتر ہونے کے لیے دست دعا بھی اٹھایا فجزاھم اللہ خیر الجزا، مولانا سید محمد رابع ندوی بھی قلبی تکلیف کی وجہ سے تشریف نہیں لائے، اللہ تعالیٰ صحت یاب کرے، آمین۔

اس سال دارالمصنفین میں معزز مہمانوں کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا، ۳،۴/اپریل کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب نسیم احمد صاحب پولیو مہم کے سلسلے میں اعظم گڑھ اپنے نو رکنی وفد

کے ساتھ تشریف لائے تو انہوں نے سرکاری وغیر سرکاری آسایش کی جگہوں کے بہ جائے ازراہ کرم دارالمصنفین کے قیام کو ترجیح دیا، ان کے اعزاز میں ایک جلسے کا انتظام کیا گیا جس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے سرسید تحریک سے علامہ شبلی کا رشتہ اور ان کی ذہنی تربیت میں اس کا حصہ بتاتے ہوئے دارالمصنفین کو بھی اسی دریا کی موج بتایا اور اس کا اعتراف کیا کہ علی گڑھ کی علمی فضا پیدا کرنے میں علامہ شبلی کا سب سے بڑا ہاتھ تھا، تعلیم کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ دنیا کی قیادت وامامت اس کے ہاتھ میں ہوگی جس کے ہاتھ میں علم کا پرچم ہوگا، انہوں نے علم وصحت دونوں کی طرف توجہ دلائی اور دونوں کے فائدے بتائے، مسلمانوں پر علحدگی پسندی اور انتہا پسندی کے الزام کی تردید کی، اسلام کو امن وسلامتی کا مذہب اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اتحاد کا داعی قرار دیا، ملک کے دینی مدارس کے خلاف، فسطائی عناصر کی یلغار کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی وجہ سے مسلمانوں کا رشتہ دین سے قائم اور ملی تشخص برقرار ہے مگر مدارس میں عقائد وعبادات پر زیادہ زور دینے اور اعمال ومعاملات کو نظر انداز کیے جانے کی شکایت کی کیوں کہ اس کی وجہ سے اسلام کے خلاف غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں۔

وائس چانسلر صاحب نے ۱۹۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ کی رو سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دائرۂ عمل کے وسیع ہونے اور اس پر ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی وثقافتی فروغ کی خاص ذمہ داری عائد ہونے کا ذکر کیا، سرسید کے تعلیمی خاکے میں عصری علوم کے ساتھ دینی تعلیم کو بھی خاص اہمیت دی گئی تھی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی، انہوں نے یونیورسٹی کے دینی مدارس سے رشتوں کو استوار کرنے میں سائنسی علوم کی تدریس اور سائنسی فکر پیدا کرنے کی کوشش کا ذکر کیا، یونیورسٹی کے مرکز فروغ سائنس نے اردو زبان میں سائنسی لٹریچر بھی تیار کیا ہے، علم کو دو خانوں میں بانٹ دینا ہی مسلمانوں کے زوال کا آغاز ہے، اس لیے انہیں دینی ودنیاوی تعلیم کی اہمیت کو پیش نظر رکھنا چاہیے، مذہبی تعلیم کا مقصد اچھا مسلمان بنانا ہے تو طالب علم کو سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی میں موثر حصہ لینے، عدل قائم کرنے اور ظلم کو مٹانے کے قابل بھی بنانا چاہیے، پیشہ ورانہ کورس شروع کرکے علاقائی ضرورتیں پوری کرنے اور اپنی معاشی حالت بہتر بنانے پر زور دیا اور بتایا کہ عصری تعلیمی اداروں کے بچوں کو اپنے گھروں یا پڑوس کی مساجد میں دینی تعلیم حاصل کرنا چاہیے ان سے اور جمعہ کے خطبوں کے خداداد نظام سے بھی صلاح وفلاح کا کام لینا چاہیے، انہوں نے دارالمصنفین کے شعبے دیکھے اور کارکنوں کی سادگی، اخلاص، ایثار اور قربانی سے بہت متاثر ہوئے جس کا ذکر اپنے گرامی نامہ میں بھی کیا جو اسی اشاعت میں شامل ہے۔

مقالات

اسپین

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں؟

از پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خاں ☆

''۱۹۹۲ء میں موتمر عالم اسلامی کے زیر اہتمام ایک بین الاقوامی سمینار لاہور (پاکستان) میں منعقد ہوا تھا، اس میں کلکتہ کے مشہور دانش ور، ماہر تعلیم اور سائنس کے مورخ پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خاں نے بھی شرکت کی تھی اور اپنا مقالہ پیش کیا تھا، جس کے متعلق وہاں کے موقر اخبار ''ڈان'' مورخہ ۱۳/ مارچ ۱۹۹۲ء کے شمارے میں ان کا یہ انٹرویو شائع ہوا تھا، جس کے بعض تجزیوں سے چاہے کسی کو اتفاق نہ ہو، تاہم یہ دلچسپ اور معلومات افزا ہے، اس لیے اس کا اردو ترجمہ معارف کے قارئین کی دل چسپی کے لیے شائع کیا جارہا ہے'' (ض)۔

سوال: لاہور کے سمینار میں آپ کے مقالے کا موضوع کیا تھا؟

جواب: ''اسلامی اسپین میں سائنس کی تاریخ''۔

سوال: اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسپین میں سائنس کی ترقی وترویج میں نمایاں حصہ لیا تھا؟

جواب: بے شک میرے مقالے کا تعلق قاضی صاعد الاندلسی کی کتاب ''طبقات الامم'' سے تھا، جسے میں دنیا کی سب سے پہلی سائنس کی تاریخ سمجھتا ہوں، اگر میں اندلس میں سائنس کی تاریخ کے بارے میں گفتگو کروں تو یہ بحث طویل ہو جائے گی، اس لیے میں مختصراً کچھ کہنا چاہوں گا،

☆ پارک اسٹریٹ، پوسٹ بکس نمبر 9448 کلکتہ، 700016 مغربی بنگال۔

جہاں تک علم الھیئۃ کا سوال ہے مسلمانوں نے اندلس (طلیطلہ) میں 'TOLEDAN TABLES' تیار کیا
تھا جو یورپ میں بعد میں علم الھیئۃ کی تاریخ کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔

سوال: 'TOLEDAN TABLES' کیا ہے؟

جواب: یہ ستاروں کے جدول ہیں جس کو طلیطلہ کے مسلمان ہیئت دانوں نے برسوں کی محنت کے بعد تیار کیا تھا اور یہ گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں پایہ تکمیل کو پہنچا، اس کی تیاری میں مشہور اندلسی مسلمان ہیئت داں الزرقانی اور قاضی صاعد الاندلسی نے نمایاں کام انجام دیا تھا، طلیطلہ ہی میں بارہویں صدی عیسوی میں ان جدولوں کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا اور اسی صدی میں بہت سی دوسری عربی سائنس کی کتابوں کا ترجمہ عبرانی اور لاطینی زبانوں میں ہوا، اس صدی میں بہت سے اسطرلاب بھی وہاں بنائے گئے تھے، ایک اسطرلاب موجود ہے جسے طلیطلہ میں ۱۰۶۸ء میں بنایا گیا تھا اور یہ واقعی بہت اہم ہے۔

سوال: اندلس کے بعض نہایت اہم سائنس دانوں کے نام کیا تھے؟

جواب: اہم مسلمان سائنس دانوں میں جو سب سے پہلا نام ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ ابو القاسم الزہراوی کا ہے، وہ موجودہ دور سے قبل دنیا کے سب سے بڑے سرجن تھے پھر اس کے بعد الزرقانی کا نام آتا ہے، جو بہت بڑے ہیئت داں تھے، قاضی صاعد الاندلسی کا شمار بھی بڑے ہیئت دانوں میں ہوتا ہے، میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ TOLEDAN TABLES کی تیاری میں الاندلسی نے نمایاں کام انجام دیا ہے، اسی طرح اندلس کے مسلمانوں نے علم الحساب اور علم الہندسہ کی ترقی و ترویج میں کافی حصہ لیا ہے خاص طور سے علم الہندسہ (GEOMETRY) اور علم الحساب (ARITHMATIC) میں، ان کے علاوہ اندلس میں دوسرے مسلمان سائنس دانوں نے بھی اعلیٰ کام لیا ہے۔ یونانی طب کا رواج دیر سے اندلس میں ہوا اور یہاں بہت سے کامیاب اطباء نے مطب قائم کیا، مثلاً ابن زہر وغیرہ، حقیقت تو یہ ہے کہ اندلس میں چار قسم کے سائنس کی ترقی میں مسلمانوں نے خاص طور سے حصہ لیا، علم طب، علم الہندسہ، علم الحساب اور علم الہیئۃ، انہوں نے علم النجوم (ASTROLOGY) میں بھی دلچسپی لی لیکن اسلام میں اس کی ممانعت ہے، کافی لوگ علم النجوم میں اس لیے دلچسپی لیتے تھے کہ ان کو کسب معاش میں اس سے کافی مدد ملتی تھی اور حکمرانوں کے علاوہ وزراء اور امراء ان کی

سرپرستی کرتے تھے، ان کے بچوں کی پیدائش کے وقت یہ زائچہ تیار کرتے تھے اور معاوضہ کے طور پر کافی کما لیتے تھے، ان کو ان بچوں کی پیدائش کے وقت ستاروں کے حالات اور ان کے مقام کا مشاہدہ کرنا پڑتا تھا، اس سے بہت کچھ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بچے زندگی میں کامیاب ہوں گے یا نہیں۔

علم طب سے بھی کسب معاش میں کافی مدد ملتی تھی اس وجہ سے طب یونانی اندلس میں کافی رائج ہوا اور اس کی بڑی اہمیت ہوئی، اس کے علاوہ مریضوں اور اپاہج لوگوں کا علاج کرنا اور ان کو راحت پہنچانا اللہ کے نزدیک عمل صالح تھا، اچھے اور مشہور طبیب کافی کما لیتے تھے، کیوں کہ نہ صرف غریب طبقہ کے لوگ بلکہ امرا بھی ان سے رجوع کیا کرتے تھے، علاج کے بعد جو لوگ صحت یاب ہو جاتے تھے وہ کافی معاوضہ بھی دیتے تھے۔

سوال: کیا علم النجوم اور زائچہ کی تیاری اسلامی تعلیم کے خلاف ہے؟

جواب: جی ہاں! علم النجوم (ASTROLOGY) کی اجازت اسلام نہیں دیتا ہے، اگرچہ اس کی ممانعت کی گئی ہے پھر بھی مسلمان ہیئت دانوں میں اس کا رواج کافی تھا اور مسلمان نہ صرف اندلس میں بلکہ ساری دنیا میں اس سے دلچسپی لیتے تھے اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ یہ ایک ذریعۂ معاش بھی تھا، اگر کوئی کسی شخص کے مستقبل کے بارے میں کچھ بتائے اور اس میں تھوڑی بہت سچائی بھی ہو تو اس کو کافی معاوضہ دیا جاتا تھا، زائچہ تیار کرنے والوں کو ہزاروں دینار بطور معاوضہ ملتے تھے اور علم طب نے بھی کافی ترقی کیا کیوں کہ یہ ذریعۂ معاش تھا، طبابت ایک پیشہ تھا جس سے بیمار اور درد و دکھ میں مبتلا لوگوں کی خدمت بھی کی جاسکتی تھی، اسلام کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ انسانیت کی فلاح و بہبودی کے کام کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور یہ کام علم طب سے بحسن و خوبی انجام پذیر ہوتا ہے۔

سوال: مشہور فلسفی ابن رشد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: آپ نے بہت بڑے مسلمان فلسفی کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق اسلامی اسپین سے تھا، انہوں نے عہد وسطیٰ میں ارسطو کی فلسفیانہ کتابوں کی جو تفسیریں لکھی تھیں، وہ دنیا میں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں، اس زمانے میں ان کی یہ تفسیریں سب سے اچھی اور صحیح سمجھی جاتی تھیں، آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں خاص کر پرنسٹن (امریکہ) اور سلامانکا (اسپین)

میں ابن رشد جن کو AVERROOS کے نام سے بھی جانتے تھے، ان کی خیالی تصویر لگی ہوئی ہے۔

سوال: اسلامی اسپین نے سائنس کی ترقی و ترویج میں جو حصہ لیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں کے علما، سائنس داں اور عقلیت پرست تھے لیکن موجودہ اسلامی دنیا میں لوگ عقلیت پرستی سے بہت دور ہو کر بنیاد پرست بن گئے ہیں جن کا نتیجہ ظاہر ہے، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اسلامی تاریخ میں مسلمان ہمیشہ دو طبقے میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں، ایک عقلیت پرست اور دوسرا بنیاد پرست، مثال کے طور پر ابن رشد اور امام غزالی میں بہت اختلافات تھے، وہ عقلیت پرست تھے اور یہ بنیاد پرست۔

امام غزالی نے (گیارہویں صدی عیسوی میں) ایک بہت ہی اہم کتاب ''تہافۃ الفلاسفہ'' لکھی تھی، اس کے ڈیڑھ سو سال بعد اس کتاب کی رد میں ابن رشد نے ''تہافۃ تہافۃ الفلاسفہ'' تحریر کی، غزالی نے اپنی اس کتاب میں ان مسلمان فلسفیوں پر سخت تنقید کی تھی جو ارسطو کے فلسفے کی پیروی کرتے تھے، ابن رشد نے ان کی تنقید کا اس کتاب میں خاطر خواہ اور اطمینان بخش جواب دیا تھا، یہ کتاب زمانۂ وسطی میں بہت مقبول ہوئی خاص طور سے یورپ میں، مندرجہ بالا تاریخی واقعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابن رشد عقلیت پرست تھے اور غزالی بنیاد پرست۔

سوال: الغزالی پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی عقلیت پرستی کے دھارے کو روک دیا اور اس طرح مسلمانوں کی سائنس سے دلچسپی کم ہوگئی، کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

جواب: نہیں! اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بنیاد پرست تھے مگر وہ راسخ العقیدہ مسلمان اور صوفی تھے، لہٰذا ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اسلام کے احکام اور اصولوں کی پابندی نہ کریں، جہاں تک سائنس کا تعلق ہے، انہوں نے اس کی مخالفت نہیں کی اور کہیں بھی منطق کے خلاف نہیں لکھا جیسا کہ ابن تیمیہ نے منطق کے خلاف ایک اہم کتاب ''الرد علی المنطقیین'' لکھی تھی، دراصل الغزالی نے ارسطو کے مقلد مسلمان فلسفیوں کی مخالفت میں جو کچھ لکھا ہے اس میں طریقۂ استدلال بنیادی طور پر منطقی ہے۔

سوال: الغزالی نے مسلمان فلسفیوں پر جو تنقید کی تھی اس کی بنیاد کیا تھی؟

جواب: میں یہ کہہ چکا ہوں کہ ہر زمانے میں مسلمان دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے، بنیاد پرست اور عقلیت پرست، مثال کے طور پر امام ابوحنیفہ، امام مالک بن انس، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل اسلامی فقہ کے بانی تھے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے، مسلمانوں میں عقلیت پرست فلسفی الکندی، الفارابی، ابن سینا اور ابن رشد وغیرہ تھے، عقلیت پرست ہونے کی وجہ سے الکندی اسلام کی بعض بنیادی تعلیم سے اختلاف رکھتے تھے، ارسطو کی پیروی کرتے تھے، لہٰذا الغزالی کو ان لوگوں سے اختلاف تھا اور انہوں نے ان مفکروں پر تنقیدیں کیں۔

سوال: کیا اسپین میں بھی بنیاد پرست مفکر تھے؟

جواب: یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ابن رشد جیسے عقلیت پرست کا تعلق اسلامی اسپین سے تھا مگر یہاں بھی بنیاد پرست مسلمانوں کی کمی نہ تھی، مثلاً ابن حزم اسپین کے بنیاد پرست تھے، مذہبی معاملات میں وہ راسخ العقیدہ تھے، بنیاد پرست اور عقلیت پرست مسلمانوں میں اختلاف کا ایک اہم سبب مادے کی تخلیق تھی، سوال یہ تھا کہ مادے کی تخلیق کیسے ہوئی؟ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ نے "کن فیکون" کہا اور اس دنیا کی تخلیق ہوگئی، لیکن ارسطو کی تعلیم ہے کہ کسی نفی سے اثبات پیدا نہیں ہو سکتا، لہٰذا عقلیت پرست مسلمان فلسفیوں نے ارسطو کی تعلیم کو قبول کر لیا جو اسلامی عقیدہ اور قرآن کی تعلیم کے خلاف تھا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مادہ بھی خدا کے ساتھ ساتھ ازلی ہے لیکن بنیاد پرست اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کا ایمان یہ تھا کہ اگر مادہ کو خدا کے ساتھ ازلی سمجھ لیا جائے تو خدا کی وحدانیت ختم ہو جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ازلیت کی خصوصیت مادہ میں بھی موجود ہے، اس طرح دو خدا ہو جاتے ہیں، ایک مادہ اور دوسرا خدا، اس لیے ارسطو کی تعلیم پر کوئی بھی راسخ العقیدہ مسلمان ایمان نہیں لا سکتا تھا، ابن سینا نے ارسطو کی اس تعلیم کو قبول کر کے لکھ دیا کہ مادہ ازلی ہے اس لیے عقلیت پرستوں کے ساتھ کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مادہ اور خدا دونوں ازل سے موجود ہیں، اسلام کی تعلیم کے مطابق ازلیت صرف خدا میں ہے، مادہ میں نہیں کیوں کہ اس کو خدا نے ہی پیدا کیا ہے، اگر کسی بنیاد پرست سے ارسطو یہ سوال کرتا ہے کہ خدا نے مادہ کس طرح پیدا کیا تو اس کا جواب ارسطو کے لیے اطمینان بخش نہ ہوگا، اس لیے مسلمان عقلیت پرست فلسفی کی یہ تعلیم تھی کہ مادہ ازل سے خدا کے ساتھ تھا اور اس مادہ سے خدا نے دنیا کی تخلیق کی۔

سوال: کیا مسلمان عقلیت پرست فلسفی معتزلہ کے فلسفے سے متاثر ہوئے تھے؟

جواب: معتزلہ کے فلسفے کا عروج وزوال مشرق میں ہوا تھا، اپنے مطالعہ کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ معتزلی فلسفیوں کا کوئی خاص اثر اسلامی اسپین پر نہیں تھا۔

سوال: وہ کون سے اسباب تھے جن سے مسلمانوں کا اسپین میں زوال ہوا؟

جواب: اس اہم سوال کا جواب بہت طویل ہے، مسلمانوں کا اسپین میں زوال اور وہاں سے ان کا اخراج خود ان کی اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہوا، وہ ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے، عرب قبائل کے ساتھ "بربر" بھی وہاں بس گئے تھے اور عرب خود مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے، مثلاً نزاری، قحطانی، شمالی اور جنوبی عرب کے قبائل، اسپین کے مقامی لوگوں میں جو حلقہ بگوش اسلام ہوگئے تھے وہ بھی آپس میں لڑتے رہتے تھے، ان کی کمزوری سے نہ صرف عیسائی فائدہ اٹھاتے بلکہ ان کی سیاسی اور عسکری طاقت میں اضافہ ہوتا رہتا تھا، یہ اسپین میں مسلمانوں کے زوال کا ایک بہت بڑا سبب تھا، اس کے علاوہ اور بھی اسباب تھے جن کی تفصیل یہاں بیان کرنا ممکن نہیں۔

سوال: یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ مسلمانوں کا اخراج ان شہروں اور مقامات سے کیسے ہوا جہاں خود ان کی حکومت تھی اور جہاں وہ خود برسر اقتدار تھے، مسلمانوں نے اسپین میں سات سو سالوں تک حکومت کی تھی لیکن پھر بھی وہاں سے ان کا نام ونشان تک مٹ گیا؟

جواب: آپ نے جو کچھ کہا میں اس سے بہت حد تک اتفاق کرتا ہوں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ منگولوں نے ۱۲۵۸ء میں عراق اور ایران پر حملہ کیا اور بغداد کو تباہ وبرباد کردیا، لاکھوں مسلمانوں کو قتل کر ڈالا لیکن کچھ عرصہ بعد ان لوگوں نے خود اسلام قبول کرلیا اور اسلامی تہذیب و تمدن کے بہت بڑے سرپرست ہوگئے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے جو جانی، مالی اور تہذیبی نقصانات منگولوں کی وجہ سے ہوئے تھے اس کی بہت حد تک تلافی ہوگئی، لیکن اسپین میں مسلمانوں کا جو زوال ہوا وہ مکمل طور پر ہوا اور بعد میں جس کی کوئی تلافی نہ ہوسکی۔

اسپین میں مسلمانوں کے زوال سے متعلق جاننے کے لیے اسلامی تاریخ کی ابتدا پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، جب مسلمانوں نے فلسطین اور بیت المقدس کو عیسائیوں سے حاصل کرلیا تھا، اس واقعہ نے عیسائیوں اور مسلمانوں کے تعلقات میں بغض وعناد کی بنیاد ڈال دی تھی، کیوں

کہ یہ عیسائیوں کے مقدس مذہبی مقامات تھے، جن پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا تھا، اس وجہ سے عیسائی ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ وہ ان کو مسلمانوں سے پھر فتح کرلیں، اس مقصد کے پیش نظر دنیا کے عیسائی خاص طور سے یورپ کی عیسائی حکومتوں نے تین سو پچاس سالوں تک مسلمانوں سے جنگ لڑی، جنہیں صلیبی جنگ کہا جاتا ہے، لیکن وہ ان دونوں مقامات کو فتح نہ کرسکے، اسپین میں عیسائیوں نے مسلمانوں سے جنگ میں مکمل کامیابی حاصل کی لہذا اسپین میں مسلمانوں کے زوال کو اس بغض وعناد کی تاریخی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے، جب کہ عیسائی فلسطین اور بیت المقدس کو مسلمانوں سے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے، لیکن اسپین میں انہوں نے مستقل طور پر مسلمانوں کو شکست دے دی اور ان لوگوں کو اسپین سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا۔

سوال: ایک مسلم مورخ مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ اسپین میں مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہاں "بنوامیہ" یعنی "بنومروان" کی حکومت تھی اور اس کا اسلام سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا، یعنی اسپین میں عرب مسلمانوں کی حکومت تھی لیکن اسلامی حکومت نہیں تھی، مولانا گیلانی نے دوسرے مورخین کے حوالے سے لکھا ہے کہ جن عربوں کی وہاں حکومت تھی ان میں جارحانہ وطن پرستی کا جذبہ نمایاں تھا، جیسا کہ دمشق میں ان کی حکومت کے دوران تھا، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: مسلمانوں کا اسپین سے مکمل اخراج ایک بہت بڑا حادثہ ہے اور اس کا صرف ایک سبب ہی نہیں ہوسکتا بلکہ اور بھی بہت سارے اسباب ہیں، ایک اہم سبب کی طرف اشارہ کرتا ہوں، ۱۰۳۱ء میں مسلمانوں کو شکست دے کر "قرطبہ" پر عیسائیوں نے قبضہ کرلیا اس کے بعد "بنوامیہ" کی سلطنت جو اسپین میں تھی وہ مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں ٹوٹ کر تقسیم ہوگئی، یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بہت کمزور تھیں، جب "قرطبہ" کو عیسائیوں نے فتح کرلیا اس وقت بھی مسلمان آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آتی تھیں وہاں بھی لوگ آپس میں لڑنے لگتے تھے، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی سلطنت پر جو زوال آنے کا خوف تھا وہ اس بات سے بے خبر تھے لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ ایک مسلم سلطنت دوسری مسلم سلطنت کو شکست دینے کے لیے اس کے خلاف عیسائی حاکموں سے معاہدے کیا کرتی تھی، یہ بھی افسوس کی

بات تھی کہ ایک کمزور اسلامی سلطنت ، طاقت ور عیسائی حاکموں سے مدد لے کر دوسری طاقت ور اسلامی سلطنت پر حملہ کیا کرتی تھی اور اس کو شکست دے کر تباہ و برباد کردیتی تھی ، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چھوٹی چھوٹی اسلامی سلطنتیں ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئیں اور جو باقی بچ گئی تھیں ان پر عیسائیوں نے حملہ کر کے آسانی سے انہیں اپنے قبضے میں کرلیا، یہ ایک فاش غلطی تھی جو اسپین کے مسلمانوں نے کی اور اسی طرح کی فاش غلطی ترکوں نے بھی کی تھی۔

میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ''مکہ'' کے شریف برطانیہ کے ایما پر اور اس کے ساتھ سازش کر کے سلطنت عثمانیہ کو پیچھے سے خنجر ماردیا، برطانیہ نے شریف مکہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ فلسطین کے ٹکڑے نہیں ہونے دے گا لیکن اس نے وعدہ خلافی کی اور فلسطین کے ٹکڑے کر کے اسرائیلی سلطنت قائم کردی۔

سوال: مولانا گیلانی نے ابن خلدون کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ اندلس کا خطہ بہت زرخیز نہیں تھا اس وجہ سے اندلس اور اس کے آس پاس کے علاقوں سے زمین کا لگان بہت زیادہ نہیں ملتا تھا، بنو عباس کو جو لگان صرف حجاز سے ملتا تھا اس سے بھی وہ لگان کم تھا، آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اندلس کے سارے خطے غیر زرخیز تھے، اس کے بعض خطے بہت ہی زرخیز تھے، مثال کے طور پر وادی الکبیر کا خطہ بہت ہی زرخیز تھا، ''بربر قبائل'' کو گوڈ راما میں بسایا گیا تھا کیوں کہ وہ زراعت کے لیے بہت زیادہ زرخیز نہ تھا، ان کا پیشہ جانوروں کی دیکھ بھال کرنا تھا، یہی وجہ تھی کہ ''بربر قبائل'' عربوں کے دشمن بن گئے تھے، کیوں کہ وہ یہ جانتے تھے کہ زرخیز زمینیں صرف عربوں میں تقسیم کی گئی ہیں اور ان کو کوئی زرخیز زمین نہیں دی گئی بلکہ ایک ایسی زمین دی گئی ہے جو صرف مویشیوں کی چراہ گاہ کے کام ہی آسکتی ہے۔

سوال: اس وقت اندلس میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟

جواب: مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے بعد اسپین میں بہت ہی کم مسلمان رہ گئے تھے، لیکن آج اسپین اور وہاں کے مسلمانوں کی حالت بدل رہی ہے اور موجودہ اسپین میں ہوا کا رخ مسلمانوں اور اسلام کے حق میں ہے، اس بین الاقوامی سمینار میں اسپین سے پانچ لڑکے اور لڑکیوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا، یہ پانچوں اسلام قبول کرچکے ہیں، ان لوگوں نے اسپین کے تعلق سے

یہ انکشاف کیا کہ پچھلے چند سالوں میں تقریباً تین ہزار عیسائی وہاں مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔

سوال: کیا مسلم ممالک اسپین میں اسلام کی نشر و اشاعت میں دلچسپی لے رہے ہیں؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے مسلم ادارے اسپین میں اسلام کو پھیلانے کی کوشش کررہے ہیں، خاص طور سے جماعت اسلامی کے لوگ، حکومت مصر نے اسپین کے موجودہ دارالسلطنت ''میڈریڈ'' میں ایک بہت ہی اہم ادارہ قائم کیا ہے، اس ادارے کا خاص مقصد اسلامی تہذیب وتمدن کے بارے میں اسپین کے لوگوں کو معلومات فراہم کرنا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسپین میں بہت سارے اسباب ایسے موجود ہیں جن سے یہاں کے باشندوں کو اسلام اور مسلمانوں سے متعلق دلچسپی پیدا ہوسکتی ہے، وہ پانچ نو مسلم لڑکے اور لڑکیاں ''قرطبہ'' میں رہتے ہیں جو مسلمانوں کا دارالسلطنت تھا، وہ وہاں کی شاندار اور عالی شان مسجد قرطبہ کو روزانہ دیکھتے اور اس کے پس منظر سے دلچسپی لیتے ہوں گے اس کی وجہ سے وہ خود اپنے آپ سے یہ سوال کرتے ہوں گے کہ مسلمانوں کی سماجی زندگی میں اس مسجد کا کیا کردار تھا؟

سوال: وسط ایشیا میں جو بیداری دیکھی جارہی ہے، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: وسط ایشیا ایک بڑا خطہ ہے جس میں تقریباً سبھی مسلمان ہیں، اس پر سویت روسیوں کا قبضہ تھا، یہ ۱۹۹۱ء میں آزاد ہوا اس میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں، یہ بہت جلد ترقی کریں گی جو دنیا کے مسلمانوں کے لیے مددگار ثابت ہوں گی۔

سوال: کیا عقلیت پرستی مسلمانوں میں ترقی کررہی ہے یا روبہ زوال ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے صورت حال ماضی کی طرح ہے اور میری رائے ہے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کو اپنے افکار وخیالات میں عقلیت پرستی کو داخل کرنا چاہیے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اسلام اور شریعت کی تعلیم کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے یعنی عملی طور پر اسلام کے بنیادی اصولوں پر چلنا اور ان پر قائم رہنا بہت ضروری ہے۔

☆☆☆

قرآن میں غیر عربی الفاظ

از جناب حماد ظفر سلفی ☆

اللہ رب العزت نے ہر زمانے اور ہر قوم کی اصلاح وہدایت کے لیے رسولوں کو مبعوث کیا اور ان پر اپنی کتابیں نازل کیں۔

اس سلسلہ کی آخری کڑی قرآن مجید ہے جو عربی زبان میں ہے، انبیاء علیہم السلام پر نازل کی جانے والی کتابوں میں ایمانیات وعقاید کی جو تعلیم دی گئی ہے وہ یکساں ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان سب کا منبع ومبدا ایک ہے اور جس طرح قرآن اور دیگر کتب سماویہ میں معنوی اتحاد واشتراک پایا جاتا ہے اسی طرح لسانی اعتبار سے بھی ان میں یک گونہ موافقت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے کیوں کہ قرآن مجید فی الجملہ سابقہ کتب سماویہ کا مصدق ومہیمن اور تمام اقوام عالم کے لیے ہدایت ہے گو یہ سنت الٰہی کے مطابق ہر رسول پر نازل ہونے والی کتاب کو اس کی قومی زبان ہی میں اتری ہے۔

معرب اور دخیل الفاظ لسانیات کے ماہرین متفق ہیں کہ جس طرح دو قوموں کے میل جول اور اختلاط کا اثر ان کی معاشرتی وتمدنی زندگی پر ہوتا ہے اسی طرح ایک قوم کے افکار ومعتقدات اور زبانیں بھی دوسری قوم سے متاثر ہوتی ہیں، چنانچہ ایک قوم کی زبان دوسری قوم کی زبان کے الفاظ وتعبیرات، محاورے، استعارات اور تشبیہات کو اپنا لیتی ہے اور ان میں اپنی زبان کے صوتی و وضعی قوانین کے لحاظ سے کچھ مناسب ترمیم کے بعد اور بسا اوقات بعینہ انہیں اپنی عام بول چال روزمرہ گفتگو اور پھر اپنے اشعار وبیان میں بھی استعمال کرنے لگتی ہے، عربی زبان بھی اس اصول اور قاعدے سے مستثنی نہیں ہے بلکہ اس کی وسعت کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے۔

☆ مئو ناتھ بھنجن۔

در اصل عربی زبان کا تعلق سامی زبانوں سے ہے جس کے اولین مسکن اور جزیرہ نمائے عرب میں اس کے پہنچنے کے سلسلے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی، عربوں کی معیشت کا اصل دارومدار تجارت پر تھا جس کے لیے وہ ازمنۂ قدیم ہی سے مختلف ممالک خصوصاً ہندوستان وافریقہ کے ملکوں کا سفر کرتے رہے ہیں اور وہاں سے سامانِ تجارت درآمد کر کے مصر وشام کی منڈیوں میں بیچا کرتے تھے، ڈاکٹر شوقی ضیف لکھتے ہیں کہ:-

''ایک ہزار قبل مسیح سے ہی جنوبی عربوں اور عراق وشام اور مصر کے علاقوں کے درمیان وسیع تجارتی تعلقات قائم ہوگئے تھے ان کے قافلے ہندی مصالحہ، افریقی غلام اور یمنی خوشبوجات لیے ہوئے شرقاً وغرباً صحرائے عرب کو عبور کرتے تھے''(۱)۔

خود قرآن مجید نے بھی عربوں کے دوسالانہ تجارتی اسفار، رحلة الشتاء والصیف کا تذکرہ کیا ہے، ان اسفار میں ان ملکوں کے باشندوں سے لین دین میں ان کی زبان کے بہت سے الفاظ شعوری یا غیر شعوری طور پر عربوں کی زبان پر چڑھ جاتے، جنہیں یہ اپنے ملک میں لاتے اور بول چال میں استعمال کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے فارسی، رومی، مصری اور حبشی الفاظ ان کی زبان میں داخل ہوگئے، عربوں کے فارسی اور رومی اقوام کے ساتھ اختلاط کی ایک وجہ عربوں کی سرحدوں پر قائم ہونے والی حیرہ اور غسان کی ریاستیں بنیں، اس میل جول سے عربی زبان وادب کو بہت فائدہ پہنچا، اس واسطہ سے عربی زبان پر ایرانی ورومی تہذیب وتمدن کی چھاپ بھی پڑی اور فارسی ورومی الفاظ وتعبیرات بھی درآئیں (۲)۔

عربی لغت میں اس طرح سے جو الفاظ درآئے ہیں انہیں ''معرب'' یا ''دخیل'' کا نام دیا گیا، ''معرب'' ان غیر عربی الفاظ کو کہتے ہیں جنہیں عربوں نے استعمال کیا اور ان میں کسی قدر تبدیلی کر کے انہیں اپنے کلام واوزان کے مطابق بنالیا، ''دخیل'' ان غیر عربی الفاظ کو کہتے ہیں جنہیں عربوں نے اپنے صیغوں میں ڈھالے بغیر استعمال کیا، انہوں نے اپنے ملنے جلنے والے بہت سے قبائل کے الفاظ کو بھی اپنی لغت میں داخل کرلیا تھا، جیسے قدیم مصری، ہندی، حبشی، فارسی اور یونانی (۳)، جن لوگوں کے خیال میں قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ موجود ہیں ان کا اس پر

اتفاق ہے کہ اس میں صرف معرب الفاظ ہی استعمال ہوئے ہیں، آگے اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:۔

قرآن میں معرب الفاظ کا وجود ہے کہ نہیں!

عربی زبان میں معرب اور دخیل الفاظ کے پائے جانے پر اتفاق ہونے کے باوجود علما کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ کا استعمال ہوا ہے یا نہیں، اس نے خود اپنے بارے میں صراحت کی ہے کہ "یہ واضح عربی زبان میں ہے" اس سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ عجمی زبان کی آمیزش سے خالی ہے لیکن خود بعض قرآنی اشارات اور اس میں مستعمل بعض الفاظ و تعبیرات جو عربی طرز تمدن و معاشرت سے مطابقت نہیں رکھتیں یا صحابہ و تابعین کے بعض آثار نیز آپ ﷺ کا تمام اقوام عالم کی جانب مبعوث کیا جانا، ان سب امور سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ اس میں معرب الفاظ موجود ہیں، ایک جگہ قرآن مجید میں "حجارة من سجيل" آیا ہے جو فارسی مرکب لفظ سنگ و گل کا معرب ہے، اسی طرح سے دبیز و رقیق ریشمی کپڑوں کے لیے "سندس" و "استبرق" کا لفظ آیا ہے، یہ امور قرآن مجید میں معربات کے موجود ہونے کا پتہ دیتے ہیں، کیوں کہ ظاہر ہے عرب میں نہ یہ کپڑے بنے جاتے تھے اور نہ ہی وہ اپنی بداوت کی وجہ سے ان سے واقف تھے، جہاں تک ریشمی کپڑوں کا تعلق ہے تو ان کے لیے صرف لفظ "حریر" ہی بولا جاتا تھا لیکن جب ایرانیوں سے ان کا میل جول بڑھا تو انہوں نے کپڑوں کا استعمال کیا اور ایرانیوں سے ان کپڑوں کے جو نام سنے عربوں نے ان کی تعریب کر کے انہیں اپنی زبان میں شامل کرلیا اور ان کے لیے نئے الفاظ وضع کرنے کی ضرورت نہ سمجھی (۴)۔

لیکن دوسرا گروہ جس میں جمہور علما امام شافعی، ابن جریر، ابوعبیدہ بدرالدین زرکشی، قاضی ابوبکر اور ابن فارس وغیرہ شامل ہیں، ان کے نزدیک قرآن خالص عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے، اس میں کوئی عجمی لفظ موجود نہیں، ان کی اصل دلیل "بلسان عربی مبین" اور اسی جیسی دوسری آیات ہیں، ان کے علاوہ بعض اور وجوہ و احتمالات بھی وہ پیش کرتے ہیں، مشہور لغوی ابوعبیدہ فرماتے ہیں کہ "قرآن واضح عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے اور یہ کہنا بڑی جسارت ہے کہ اس میں غیر عربی الفاظ بھی ہیں کیوں کہ ایسی صورت میں ان کو یہ چیلنج نہیں کیا جاتا کہ "قرآن جیسی کوئی آیت یا سورہ پیش کرو"، جب کہ اس میں عربی کے بجائے دوسری زبانوں کے بھی الفاظ موجود ہیں، جن کو وہ جانتے ہی نہیں تھے، یہ چیلنج تو اسی بنا پر کیا گیا ہے کہ وہ خالص عربی میں ہے جس سے وہ اچھی

طرح واقف تھے (۵)۔

زرکشی کا خیال ہے کہ قرآن کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے عربی زبان میں نازل کیا ہے لہذا اسی زبان میں اس کی قرأت و تلاوت جائز ہوگی کیوں کہ فرمان الٰہی ہے "اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا" (۶) نیز فرمایا "وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا" (۷) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں کوئی غیر عربی لفظ نہیں ہے کیوں کہ اللہ نے اسے نبی ﷺ کے لیے معجزہ و شاہد نیز آپ ﷺ کی صداقت پر دلیل قاطع بنایا ہے اور تاکہ اس کی آیات کے ذریعہ سے وہ خالص عرب فصحا و بلغا اور شعرا کو چیلنج کر سکے اس لیے اگر قرآن غیر عربی الفاظ پر مشتمل ہوتا تو یہ چیلنج بے معنی ہوتا (۸)۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر جامع البیان کے مقدمے میں معربات کے ضمن میں اس پر مفصل بحث کی ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں سے تخاطب اسی زبان میں ہوتا ہے جسے بندے سمجھتے اور بولتے ہیں، یہ اس کا اصول ہے "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ" (۹) اور چونکہ قرآن کے اولین مخاطب عرب تھے اس لیے اسے خالص عربی زبان میں نازل کیا گیا، ارشاد ہے "اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ" (۱۰) اور رہے وہ آثار جو حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے مروی ہیں کہ قرآن میں وارد فلاں لفظ حبشی یا نبطی ہے تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ یہ لغات کا توارد ہے کہ ایک ہی لفظ کو عرب بھی استعمال کرتے تھے اور حبشی بھی، کسی لفظ کی ایک ہی زبان کی جانب نسبت اس کے دوسری زبان کا لفظ ہونے کی نفی نہیں، علامہ ابن جریر کے نزدیک یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ الفاظ اصلاً عجمی تھے اور بعد میں عربوں نے انہیں اپنی زبان میں استعمال کرلیا (۱۱)، بعض علما کے خیال میں یہ الفاظ عربی ہی ہیں مگر چونکہ عربی بڑی وسیع زبان ہے، اس لیے بعض لوگوں سے ان کا عربی ہونا مخفی رہا اور یہ کوئی بعید بات نہیں، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ پر لفظ فاطر کا معنی مخفی رہا (۱۲)، ان سے روایت ہے کہ میں فاطر کے معنی نہیں جانتا تھا مجھے اس کا علم اس وقت ہوا جب دو بدوی ایک کنویں کے بارے میں جھگڑتے ہوئے آئے اور ان میں سے ایک نے کہا "انا فطرتها" یعنی میں نے اسے کھودا (۱۳)۔

امام شافعیؒ قرآن مجید میں معربات کے ہونے کے بالکل ہی منکر ہیں "الرسالة" اور ان کی دوسری کتب کے فحوائے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ ان کے زمانے کے علما کا خاص

موضوع بحث بنا ہوا تھا اور اس کے قائلین بڑی تعداد میں تھے جن کے دعووں کا ابطال امام صاحب نے اپنی کتابوں میں کیا ہے لکھتے ہیں کہ عربی بہت ہی وسیع زبان ہے اور ہم نبی کے سوا کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے جسے پوری زبان کے علم کا احاطہ ہو، قرآن خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں کوئی غیر عربی لفظ نہیں ہے، ارشاد ہے "وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ، نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ" (۱۴) دوسری جگہ اس نے اس پہلو کو مزید مؤکد کر کے بیان کیا ہے، ارشاد ہے "وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ" (۱۵) نیز فرمایا [۱۶] "وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّ عَرَبِيٌّ" (۱۷) جو الفاظ عرب و عجم دونوں جگہ مستعمل اور رائج ہیں، امام شافعیؒ کے نزدیک ان میں اہل عجم عربوں کے تابع ہیں، لکھتے ہیں کہ جب زبانیں مختلف ہیں تو ضروری ہے کہ ایک زبان دوسری زبان کے تابع ہو اور متبوع زبان کو تابع پر فضیلت حاصل ہو، ظاہر ہے اس معاملہ میں نبی ہی کی زبان کو یہ فضیلت حاصل ہوگی کہ وہ ایک حرف اور نقطہ میں بھی کسی دوسری زبان کے تابع نہ ہو، جس طرح دیگر تمام ادیان آپ کے دین کے تابع ہیں، یہ ہم پر اور ہمارے نبی پر اللہ تعالیٰ کی مخصوص نعمت ہے "وانه لذكر لك ولقومك" (۱۸)۔

قرآن مجید میں معرب الفاظ ماننے والوں کے دلائل

زرکشی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ اور ان کے شاگرد عکرمہ وغیرہ کا قول ہے کہ قرآن مجید میں غیر عربی زبان کے الفاظ بھی موجود ہیں چنانچہ جب حضرت ابن عباس سے اللہ تعالیٰ کے قول "فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ" کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ شیر کے لیے مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ موجود ہیں، حبشی میں اسے قسورۃ کہتے ہیں (۱۹)۔

اسی خیال کی تائید جلال الدین سیوطی، ثعالبی، تاج الدین السبکی، ابن حجر العسقلانی اور دوسرے متعدد علمانے کی ہے، ان لوگوں نے "قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا" "بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ" اور اس جیسی دوسری آیات کی یہ توجیہ کی ہے کہ پورا قرآن عربی الفاظ سے بھرا ہوا ہے محض چند غیر عربی الفاظ کے، اب اگر چند غیر عربی الفاظ بھی اس میں آ گئے ہیں تو یہ اس کے عربی مبین کے منافی نہیں ہے، رہا قرآن کا واضح عربی زبان میں ہونا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی زبان میں نازل ہوا ہے جس سے اہل عرب بخوبی واقف تھے اور وہ ان کی روزمرہ گفتگو اور محاوروں میں بہ کثرت مستعمل تھے،

ابن الخطیب کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں مختلف زبانوں کے بعض عجمی الفاظ اس لیے بھی آگئے ہیں کہ عرب ان الفاظ کو اپنی گفتگو میں استعمال کرتے تھے (۲۰)، حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ ہونے کی سب سے قوی دلیل ابو میسرہ کی یہ روایت ہے کہ "انزل القرآن بکل لسان"، یعنی قرآن تمام زبانوں میں نازل ہوا ہے اور ثعالبی نے بعض لوگوں سے نقل کیا ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں قرآن میں ہیں (۲۱)، ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ قرآن میں معرب لفظ ہونے کی قوی دلیل یہ بھی ہے کہ نبی ﷺ تمام اقوام عالم کی جانب دعوت حق دینے کے لیے بھیجے گئے تھے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ" اس واسطے ضروری تھا کہ نبی مبعوث کو جو کتاب دی جائے اس میں ہر ایک قوم کی زبان کے الفاظ موجود ہوں (۲۲)۔

ابن النقیب فرماتے ہیں کہ دیگر آسمانی کتابوں پر قرآن کو یہ مزیت بھی حاصل ہے کہ ان کتابوں میں ان ہی قوموں کی زبانیں استعمال کی گئی ہیں جن پر وہ نازل کی گئی تھیں، ان کے علاوہ کسی اور قوم کی زبان کا ایک لفظ بھی ان میں نہیں آیا، مگر قرآن تمام قبائل عرب کی زبانوں پر مشتمل ہونے کے علاوہ رومی، فارسی اور حبشی وغیرہ کے الفاظ بھی اپنے اندر رکھتا ہے (۲۳)۔

دونوں فریقوں کے دلائل کا تجزیہ

قرآن مجید میں معرب الفاظ کی موجودگی کے متعلق گزشتہ صفحات میں فریقین کے جو دلائل بیان کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ عربی زبان کے تاریخی حقائق، اس کے ارتقا و تغیر، عربوں کے تمدنی و معاشرتی حالات نیز قرآن میں مستعمل کچھ مخصوص الفاظ و تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ کا استعمال بھی ہوا ہے کیوں کہ جو لوگ اس کے منکر ہیں ان کے انکار کی چار وجہیں ہیں:-

۱۔ قرآن مجید کا خود اپنے اندر غیر عربی الفاظ ہونے کی نفی کرنا۔

۲۔ اہل عرب سے قرآن مجید کی تحدی اسی وقت روا ہو سکتی ہے جب اس میں غیر عربی الفاظ نہ ہوں (۲۴)۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ رسولوں کو ان کی قوم کی زبان میں اپنا پیغام پہنچانے کے لیے مامور کیا ہے کیوں کہ اللہ جیسی حکیم ذات کا بندوں کو ناقابل فہم زبان میں مخاطب کرنا بہت ہی بعید ہے۔

۴۔ عربی نہایت وسیع زبان ہے اس کی وجہ سے بعض اہل علم اس کے کچھ الفاظ سے

واقف نہیں ہوسکے اور اسے غیر زبان کا لفظ یا انہیں لغات کا توارد سمجھ لیا۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بعض اہل عرب قرآن میں سرے سے عجمی الفاظ کے ہونے کو تسلیم نہیں کرتے، ان کے خیال میں وہ کاملاً عربی زبان میں ہے، جس کی دلیل قاطع ''بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ'' ہے، حالانکہ قرآن مجید کا عربیت سے متصف ہونا اس معنی میں ہے کہ عرب اسے بولتے اور سمجھتے تھے اور قرآن میں ایسی کوئی چیز نازل نہیں ہوئی جو ان کے ذہن و دماغ کے لیے اجنبی اور نامانوس ہو، اوپر یہ بتایا گیا تھا کہ عربوں کے دوسری قوموں سے اختلاط کے بعد غیر اقوام کے جو الفاظ ان میں رائج ہوئے وہ ان کے لیے اس لیے اجنبی نہیں رہ گئے تھے کہ انہوں نے ان کی تعریب کرکے انہیں اپنی روزمرہ گفتگو میں استعمال کرنا شروع کردیا تھا، اس طرح ان غیر عربی لفظوں کا رواج عربی زبان میں پوری طرح ہوگیا تھا اس لیے وہ بھی عربی الفاظ سمجھے جانے لگے تھے (۲۵)، اگر ان لفظوں کے اندر کسی طرح کی غرابت پائی جاتی تو خود اہل عرب نزول قرآن کے زمانہ میں اس پر ضرور معترض ہوئے ہوتے۔

قرآن مجید میں معربات کے ہونے نہ ہونے میں اختلاف کا باعث یہ ہوا کہ فریقین معربات کے مفہوم و مراد کی تعیین میں مختلف الرائے ہیں جیسا کہ نفی کرنے والوں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سے یہ مراد لیا کہ معرب الفاظ عربوں کے لیے بالکل نئے تھے وہ اسے بولتے اور سمجھتے نہیں تھے اس لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ کا بندوں سے اس طور سے مخاطب ہونا اور قرآن میں ایسے الفاظ کا وارد ہونا بعید از قیاس سمجھا جبکہ قرآن مجید میں معربات کے قائلین نے اسے دوسرے مفہوم میں لیا ہے جس کی عکاسی امام ابن عطیہ نے اس طرح کی ہے ''قرآن عرب عاربہ کی لغت میں نازل ہوا، لیکن تجارت اور دوسرے اغراض سے ہونے والے اسفار میں عربوں نے عجمی الفاظ کو بھی قبول کرلیا اور ان کی ثقالت دور کرنے کے لیے بعض حروف میں انہوں نے تبدیلی کردی اور انہیں اپنے اشعار و محاورات میں استعمال کیا تا آنکہ وہ فصیح عربی کے قالب میں ڈھل گئے اور ان میں بیان و وضاحت پیدا ہوگئی، چنانچہ اسی انداز پر قرآن کا نزول ہوا (۲۶)۔

معربات قرآن پر ایک نظر

معربات قرآن کا مطالعہ مختلف جہتوں سے کیا جاتا رہا ہے، جن لوگوں نے معرب الفاظ کی تعیین و تحدید کی کوشش کی ہے، ان میں ثعالبی، ابن فارس، ابن جریر طبری،

زرکشی اور حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ شامل ہیں، بعض لوگوں نے اس پر الگ سے رسائل بھی تحریر کئے ہیں، زرکشی نے البرہان کے اندر متعدد معرب الفاظ کو ان کی تعیین و تشریح کے ساتھ جمع کیا ہے، قاضی تاج الدین سبکی نے ۲۷ معرب الفاظ کو منظوم شکل میں پیش کیا ہے، ابن حجر نے مزید ۲۴ الفاظ کا اضافہ کیا، ان کے بعد سیوطی نے ان میں مزید ساٹھ سے زیادہ الفاظ کو جوڑ دیا ہے، اس طور سے سو سے زیادہ معرب الفاظ ابیات کی شکل میں جمع ہوگئے (۲۷)، اس سلسلہ میں سیوطی نے دو علاحدہ کتابیں تصنیف کی ہیں، ایک کا نام "المهذب فيما وقع في القرآن من المعرب" ہے اس میں معربات کے تعلق سے مختلف علما کے خیالات پیش کیے گئے ہیں اور آخر میں معرب الفاظ کی ایک طویل فہرست دی ہے، دوسری کتاب "المتوکلی" ہے اس میں صرف معرب الفاظ کا ذکر ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ قرآن میں جن عجمی زبانوں کے الفاظ کا ذکر ہے ان سب کو الگ الگ زبانوں کی تعیین کے ساتھ جمع کردیا گیا ہے، ذیل میں قرآن میں مستعمل کچھ معرب الفاظ کو ان کے عربی مترادفات کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

حبشی: الجبت (الشيطان، الطاغوت) الكاهن (حوبا، اثما) وغیرہ۔

فارسی، الاستبرق: (الديباج الغليظ) كوّرت (غورت) مقاليد (مفاتيح) وغیرہ۔

رومی، فصرهنّ: (فقطعهن) الفردوس: (البستان) القسط (العدل) وغیرہ۔

عبرانی، كفّر: (محا) مرقوم: (مكتوب) اخلد: (ركن) وغیرہ۔

نبطی، اسفارا: (كتبا) الحواريون: (الغسالون للثياب) السفرة: (القراء) وغیرہ۔

اس کے علاوہ ہندی، قبطی، ترکی، زنجی اور بربری زبان کے بھی متعدد الفاظ قرآن میں آئے ہیں (۲۸)۔

قرآن مجید میں معرب الفاظ لانے کی حکمت اور فائدے

یہ بڑا اہم بحث ہے کہ قرآن مجید میں معرب الفاظ کیوں استعمال کئے گئے ہیں، اس کے فوائد و مقاصد کیا ہیں جبکہ اکثر ان معانی و مفاہیم کے لیے عربی الفاظ و مترادفات موجود تھے، متعدد علما نے اس پر جو بحث و گفتگو کی ہے اس سے حسب ذیل باتیں سامنے آتی ہیں، اولاً اس میں قرآن کی ہمہ گیریت کا راز مضمر ہے چنانچہ سیوطی ان الفاظ کے قرآن مجید میں لائے جانے کی حکمت یوں بیان کرتے ہیں کہ قرآن مجید اولین و آخرین کے

علوم اور واقعات و اخبار کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، لہذا ضروری تھا کہ اس میں لغات اور زبانوں کی اقسام اور تعدد کی جانب بھی اشارے کردیے جائیں تاکہ اس کا ہر چیز کو محیط ہونا حد کمال کو پہنچ جائے، چنانچہ اس مقصد سے ان سبک اور شیریں الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے جو عربوں میں کثرت سے مستعمل تھے (۲۹)، ثانیاً قرآن مجید میں جو معرب الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ان کی بلاغت و بیان کے نقطۂ نظر سے بھی اہمیت ہے، چنانچہ مصطفی صادق الرافعی رقم طراز ہیں کہ اس طرح کے قرآنی الفاظ ہی لانے میں بلاغت مضمر ہے، وہاں آیت کے نظم و سیاق کے لحاظ سے کوئی دوسرا لفظ ان کا متبادل نہیں ہوسکتا تھا (۳۰)، الجوینی قرآن میں دبیز ریشمی کپڑے کے لیے مستعمل لفظ "استبرق" کی بلاغت کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگر دنیا کے تمام فصیح اور زبان آور اشخاص مل کر بھی اس لفظ کی جگہ کوئی دوسرا فصیح و بلیغ تر عربی لفظ لانے کی کوشش کریں تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ کبھی اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہوں گے بلکہ ایسی صورت میں انہیں صریح لفظ چھوڑ کر کنایے کے مرکب الفاظ لانے ہوں گے، کیوں کہ عربی زبان میں استبرق کے معنی پر دلالت کرنے والا کوئی مفرد لفظ نہیں ملے گا اور یہ بلاغت کا مسلمہ اصول ہے کہ کسی معنی و مفہوم کی تعبیر صریح مفرد لفظ سے کرنا کنایے کے مرکب الفاظ کی تعبیر سے زیادہ بہتر ہے کیوں کہ اس سے معنی کی طرف جلد ذہن کے منتقل ہونے کے علاوہ اختصار کلام کا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے لہذا ایسے مواقع پر ایک بلیغ شخص کے لیے ایسے ہی الفاظ کا استعمال ضروری ہوتا ہے جو فصاحت کے لحاظ سے بے نظیر ہوتے ہیں (۳۱)، اس پر ایک اور پہلو سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کا اپنے اوراق میں دنیا کی مختلف زبانوں کو جمع کرنا دراصل اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو مختلف زبانیں سیکھنے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے تاکہ بولنے والوں میں الفت اور یگانگت پیدا ہو، کیوں کہ زبانوں کا اختلاف بھی اللہ کی نشانی ہے، جیسا کہ فرمایا" وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ" (۳۲)۔

مراجع وحواشی

(۱) تاریخ الادب العربی، العصر الجاہلی للدکتور شوقی ضیف، ص ۲۶ (۲) ملخصاً از عربی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، ص ۴۶ و ۴۷ (۳) الموسوعۃ العربیۃ المیسرۃ "دخیل" ۷۸۶/۱، "معرب" ۲/ ۱۷۲۰ (۴) الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی، ۱۷۹/۱ (۵) البرہان فی علوم القرآن للزرکشی، ۲۸۷/۱ و ۲۸۸ (۶) یوسف: ۲ (۷) فصلت: ۴۴ (۸) البرہان، ۲۸۷/۱ (۹) ابراہیم: ۴ (۱۰) یوسف: ۲ (۱۱) تفسیر جامع البیان، ۱۰/۱ و ۱۱ (۱۲) المہذب فیما وقع فی القرآن من المعرب للسیوطی، ص ۴۲، تقدیم وتحقیق الدکتور التہامی الراجی الہاشمی (۱۳) بحوالہ تفسیر ابن کثیر، ۱۵/۳ و لسان العرب ۳۴۳۳/۵ مادہ فطر (۱۴) الشعراء: ۱۹۲-۱۹۵ (۱۵) النحل: ۱۰۳ (۱۶) فصلت: ۴۴ (۱۷) احکام القرآن للامام الشافعی، ص ۳۱، ۳۲ (۱۸) ملخصاً ماخوذ از الرسالۃ للشافعی، ص ۴۴ تا ۴۷ (۱۹) جامع البیان، ۸/۱ (۲۰) الفرقان لابن الخطیب، مطبعۃ دار الکتب المصریۃ، ص ۲۱۰ (۲۱) الاتقان ۱۷۸/۱ (۲۲) المہذب فیما وقع فی القرآن من المعرب للسیوطی، ص ۶۲ (۲۳) الاتقان ۱۷۹/۱ (۲۴) علم اصول الفقہ تالیف عبدالوہاب خلاف، ص ۳۵ (۲۵) الفرقان لابن الخطیب، ص ۲۱۱ و ۲۱۲ (۲۶) البرہان ۲۸۹/۱ (۲۷) الاتقان ۱۸۳/۱ (۲۸) ماخوذ از المتوکلی للسیوطی (۲۹) المہذب، ص ۶۱ و ۶۲ (۳۰) اعجاز القرآن والبلاغۃ النبویۃ تالیف مصطفی صادق الرافعی، ص ۷۶ (۳۱) الاتقان ۱۷۹/۱ (۳۲) الروم: ۲۲۔

مقدمات مولانا ابوالحسن علی ندوی

از پروفیسر سید احتشام احمد ندوی ☆

اپنی کتابوں پر مقدمے لکھنا عام شیوۂ اہل روزگار ہے، عموماً مصنفین اپنا مقصد کتاب کے مقدمے میں بیان کردیتے ہیں، کتاب کا مغز و جوہر سمجھنے کے لیے مقدمے پڑھنا ضروری ہو جاتا ہے، کبھی کبھی تو مصنف اپنے مقدمہ میں ایسے علمی حقائق بیان کرتا ہے جو اصل کتاب سے زیادہ اہمیت و عظمت کے حامل ہوتے ہیں، جس شخص نے ابن سلام (م ۲۳۱ھ) کی طبقات الشعراء اور ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ) کی الشعر والشعراء اور انہیں کی دوسری کتاب ادب الکاتب کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ ان ناقدوں نے کیسے عالمانہ افکار و نظریات کا اظہار اپنے مقدموں میں کیا ہے، انہوں نے اعلیٰ تنقیدی افکار سے اپنے مقدموں کو وزن و عظمت عطا کردی ہے اور دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ مذکورہ کتابوں کے مقدمے اصل کتابوں سے افادیت میں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

اپنی کتابوں پر دوسروں سے مقدمہ لکھوانے کا بھی عام رواج ہو گیا ہے، یہ مقدمے کسی اہم شخص سے لکھوائے جاتے ہیں، اردو زبان کے سب سے بڑے مقدمہ نگار بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب تصور کیے جاتے ہیں جن کے مقدمات کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، مولوی صاحب نے جو مقدمے تحریر فرمائے ہیں وہ تحقیقی اور تنقیدی ہیں، اس عہد کے مشہور عالم اور اردو کے ممتاز صاحب قلم اور انشا پرداز مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی بہ کثرت مقدمے لکھے ہیں مگر ان کے مقدمات علمی، دعوتی اور مقصدی نوعیت کے ہیں، ان مقدموں کی تعداد بہت زیادہ ہے، مولانا اس بارے میں بڑے وسیع القلب تھے، آسانی سے وہ دوسروں کی کتابوں پر مقدمے لکھ دیتے

☆ سابق ڈین و صدر شعبہ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالہ

تھے، انہوں نے خود اپنی کتابوں پر بھی مقدمے لکھے ہیں اور خود ان کی کتابوں پر دوسروں نے مقدمے لکھے ہیں، مولانا کی پہلی تصنیف سیرت سید احمد شہید پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے عالمانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔

مولانا علی میاں کے تمام مقدمے یکساں نہیں ہیں، مقصد، کتاب، شخصیت اور موضوع کو ذہن میں رکھ کر انہوں نے مقدمے تحریر فرمائے ہیں، بعض مقدمے بڑے عالمانہ ہیں، بعض دعوتی ہیں بعض میں تحقیقی رنگ نمایاں ہے، جیسے اپنے والد بزرگوار کی کتاب گل رعنا کا مقدمہ، بعض مقدموں میں تحریک ندوۃ العلماء کے مقاصد کی عمدہ تشریح پیش کی گئی ہے، بعض مقدمے شخصی تعلقات کا اظہار کرتے ہیں، بعض بالکل مختصر ہیں اور بعض بہت مفصل، مولانا کے مقدموں کی عام خوبی ان کی جامعیت ہے۔

فلسفہ و علم تاریخ کے بانی علامہ عبدالرحمن بن خلدون نے اپنی تاریخی کتاب العبر و دیوان المبتدأ والخبر پر جو طویل مقدمہ تحریر فرمایا ہے اس میں پہلی بار علم تاریخ کا علمی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، انسانی تاریخ کا تعلق سماجی زندگی اور عمرانیات سے قائم کیا گیا ہے، مگر سب سے بڑا اعتراض علامہ ابن خلدون پر یہی ہے کہ اپنے مقدمہ میں جو فلسفہ تاریخ انہوں نے پیش فرمایا ہے، خود انہوں نے ہی اپنی تاریخ نگاری میں اس پر عمل نہیں کیا، ان کی تاریخ عام تاریخوں کی طرح جدال و قتال کے واقعات سے مملوء ہے، اس کا اصل سبب یہ ہے کہ مقدمہ انہوں نے اپنی تاریخ کو مکمل کرنے کے بعد یا تکمیل سے ذرا پہلے لکھا، یہ عالمانہ مقدمہ انہوں نے صرف پانچ ماہ میں مکمل کر لیا اور وہ خود بھی اس امر پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ اتنا مہتم بالشان اور ضخیم مقدمہ کیسے انہوں نے اتنی قلیل مدت میں مکمل کر لیا، مگر بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ علامہ ابن خلدون نے، جو چار برس مسودہ تیار کرنے میں قلعۂ بنی سلامان میں رہ کر صرف کیے اس دوران جو افکار ان کے ذہن میں مرتکز ہوتے رہے، ان کو تاریخ مکمل کرنے کے بعد مقدمہ میں تحریر کر دیا۔

بعض اوقات مقدمہ پڑھنے سے مضامین کتاب کی گرہ کشائی ہو جاتی ہے اور حقائق کھلتے جاتے ہیں، مثلاً اگر مصنف نے لکھ دیا ہے کہ یہ نوٹس ہیں جو اس نے اپنے طلبہ کے لیے تیار کیے تھے، پھر بعد میں ان کو کتابی شکل دے دی گئی یا کسی طالب علم نے اپنے استاذ کی زبانی محاضرات کو سن کر ان کا خلاصہ تیار کر لیا اور پھر ان کو کتابی شکل میں پیش کر دیا، تو ان تصریحات سے اصل کتاب کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اردو میں مولانا الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر وشاعری لکھ کر طویل مقدمہ لکھنے کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو مقدمے تحریر فرمائے ہیں ان کی کئی قسمیں ہیں، ایک مقدمہ کی قسم وہ ہے جو اسلام سے متعلق ہے اگر ان کا تعلق سیرت النبی ﷺ سے ہے تو مولانا کا مقدمہ نہایت کامیاب رہتا ہے، اس لیے کہ آں حضرت کی ذات سے ان کو خاص شغف ہے، ان کے جذبات میں روانی، ان کے خیالات میں تموج اور ان کے اسلوب نگارش میں آبشار کا سا بہاؤ نظر آتا ہے، یہی حال دعوت اسلام سے متعلق ان کے مقدمات کا ہے، اسی طرح ان مقدمات کے اندر بھی ایک خاص کیفیت اور جذباتی لگاؤ نظر آتا ہے جو ارباب ندوہ کی سوانح عمریوں پر لکھے گئے ہیں، ندوہ سے ان کا تعلق مدۃ العمر کا رہا اور اس کی تاریخ اور اس کے اشخاص سے ان کو جذباتی تعلق نظر آتا ہے، ندوہ کی تحریک سے ان کو عشق تھا، ان کے ذہن میں ان ارباب ندوہ کی سوانح حیات تیار کرانا بھی تھا جنھوں نے ندوہ کے دور اول میں اس عظیم تعلیمی تحریک کی آب یاری کی تھی، اس کے لیے ان کے ذہن میں پوری ایک اسکیم تھی، چنانچہ اس کے مطابق انہوں نے مختلف اصحاب کو کام تقسیم کر دیا، اپنے بھتیجے مولانا محمد حسنی ندوی کو مولانا سید محمد علی مونگیری کی سوانح حیات تیار کرنے کا حکم دیا جس کا آغاز وہ پہلے ہی اپنے شوق سے کر چکے تھے، اس کتاب پر مولانا نے نہایت پرمغز اور عالمانہ مقدمہ لکھا ہے، اس مقدمہ میں تحریک ندوہ کی روح اور اس کی دعوت پوری قوت اور پوری جذباتی ترجمانی کے ساتھ آگئی ہے، اس مقدمہ میں ان کا اسلوب اور ان کی فکری قوت پورے جاہ وجلال کے ساتھ نمایاں ہے۔

مولانا محمد علی مونگیری، مولانا حبیب الرحمن شیروانی اور مولانا خلیل الرحمن کی سوانح عمریوں پر مولانا علی میاں نے شان دار مقدمے تحریر فرمائے ہیں ان میں ان کے ادب وانشا کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے، وہ ایک صاحب اسلوب ادیب ہیں اور اعلیٰ انشا پردازی کی صلاحیت رکھتے ہیں، چوں کہ انہوں نے ایک مشن کے تحت یہ سوانح عمریاں لکھی ہیں یا دوسروں سے لکھوائی ہیں اس لیے ان پر مولانا نے جو مقدمے تحریر کیے ہیں ان میں دعوتی روح اپنے عروج پر ہے، خصوصاً مولانا محمد علی اور صدر یار جنگ کے مقدمے بڑے جان دار ہیں، ان میں تحریک ندوۃ العلما اور اصلاح امت کے بارے میں عالمانہ

بحثیں ہیں، مولانا عالم اسلام کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

''انیسویں صدی عیسوی پورے عالم اسلام میں سیاسی زوال اور فکری اضمحلال کی صدی ہے، اس صدی میں عالم اسلام کے نہایت زرخیز ومردم خیز ملک مغربی اقوام کے غلام بنے، اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم کو موت وزیست کی کشمکش سے سابقہ پڑا لیکن قدرت الٰہی کی عجب کرشمہ سازی ہے کہ جیسا کہ اس سے پہلے بھی کئی بار ہوا ہے، اس صدی میں عالم اسلام میں متعدد ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کی فکری سطح اور جن کے عزائم اس زمانہ سے میل نہیں کھاتے تھے اور جو اپنے افکار وخیالات، اپنی خداداد صلاحیتوں، اپنے جوہر واستعداد اور اپنے علمی وذہنی کمالات کے لحاظ سے کسی طرح اس دور انحطاط کے پیداوار نہیں معلوم ہوتے، یہ دور اکابر رجال ومردان کار کی حیثیت سے بھی ماہرین فنون اہل تصنیف واصحاب فکر کے لحاظ سے بھی اہل قلوب واصحاب باطن کے نقطۂ نظر سے بھی اور تعلیمی مرکز واصلاحی تحریکوں کے اعتبار سے بھی اور اس حیثیت سے بھی کہ اس دور میں بعض عظیم تر تعلیمی مرکز اور ادارے جو صرف درس گاہیں نہیں بلکہ مدارس فکر اور مستقل دبستان ہیں، قائم ہوئے، سارے عالم اسلام میں خصوصی امتیاز رکھتا ہے۔

اس دور کی انہیں یگانہ شخصیتوں میں ایک مولانا سید محمد علی مونگیری کی ذات بھی ہے، جو جامعیت وتوازن کا ایک نادر مرقع ہے، جس کی مثال اس دور میں مشکل سے ملے گی، للّٰہیت وربانیت، عشق وخدا مستی، کمال، اتباع سنت اور امت کی فکر، علوئے ہمت، بلندیٔ نظری، تازگی، فکر وجرأت اندیشہ، نور بصیرت وفراست ایمانی، حقیقت پسندی وعملیت، زمانہ کی نبض شناسی اور آنے والے خطرات سے آگاہی، وسعت قلب ونظر، اجتماعی کام کی صلاحیت کہ مختلف الذوق رفقاء کے ساتھ اشتراک عمل وتعاون کے لیے ہمہ وقت آمادگی، یہ مختلف اور بظاہر متضاد صفات وکمالات ان کی ذات میں اس طرح جمع اور پہلو بہ پہلو جلوہ فگن ہیں کہ دیکھنے والے کے لیے ایک مستقل امتحان بن جاتے ہیں اور وہ پکار اٹھتا ہے کہ

" گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد "

انہوں نے جس طرح جام وسنداں اور شیشہ و آہن کو جمع کیا، انہوں نے جس طرح محدود ماحول میں رہ کر باہر کی وسیع دنیا دیکھی — جس قلیل اثاثہ پر ایک ایسی عالم گیر اور انقلاب انگیز تعلیمی تحریک کی بنیاد رکھی جس کے آگے مصر و ترکی کے مصلحین بھی اس دور میں نہ جاسکے، وہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے اور وہ صرف ان کی فطرت کی ارجمندی اور ان کے جوہر کی تابانی کی دلیل ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر ان کا ضمیر وخمیر تنہا اس ماحول اور تعلیم و تربیت کا نتیجہ نہیں جو انہوں نے پائی بلکہ اس نسبت گرامی کا نتیجہ ہے جو ان کو نسبی وروحانی طریقہ سے حاصل تھی

تری آگ اس خاک داں سے نہیں "۔

(مولانا محمد علی مونگیری از محمد حسنی، باراول لکھنؤ، اپریل ۱۹۶۴ء، ص ۷ تا ۲۳)۔

چوں کہ مولانا محمد علی مونگیری کی سیرت مولانا کے اصلاحی مشن کا ایک اہم جزء ہے، اس بنا پر اس کا مقدمہ بھی بہت جان دار ہے، اب میں ایک دوسرا مقدمہ پیش کرنا چاہتا ہوں، صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کی سوانح عمری پر جو مقدمہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے، وہ بھی ان کے اصلاح ندوہ اور تاریخ ندوہ کی تکمیل کا ایک جزء ہے، لہذا مولانا شمس تبریز خاں صاحب نے صدر یار جنگ کی سوانح عمری لکھوائی اور اس پر ایک ادبی اور عالمانہ مقدمہ لکھا، پہلے مولانا نے مولانا حبیب الرحمن کے اس ماحول کی تصویر کشی کی ہے جس میں انہوں نے زندگی بسر کی تھی، پھر نواب صاحب کی شخصیت کا ایسا نقشہ پیش کیا ہے جس سے ان کی عظمت کے جوہر نکھر کر سامنے آجاتے ہیں، چنانچہ مولانا نے صدر یار جنگ کی ادبیت اور ان کے اسلوب بیان کی عظمت واضح کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ایک عالم دین کے لباس میں آتے ہیں، اس بنا پر ان کی ادبی وتنقیدی عظمت ہمارے ناقدوں نے محسوس نہیں کی، اب میں مولانا کے مقدمہ سے صرف ایک طویل اقتباس دینے پر اکتفا کروں گا جو ان کی انشاپردازی اور اعلی اسلوب کا نہایت عمدہ نمونہ ہے، جہاں ان کا فکر معراج پر ہے اور جہاں ان کی تاریخ دانی اور اقوام وملل کی تہذیب سے استخراج کی عظمت نمایاں ہے۔

مولانا صدر یار جنگ کی شخصیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:۔

"پھر ان کی زندگی کا خاص جوہر ان کی وسیع وبوقلموں وگوناگوں ثقافت تھی جس میں وہ فرد فرید تھے، ہندوستان میں اسلامی عقائد وتعلیمات کے فیض، تصوف کے پیدا کیے ہوئے درد ومحبت اور وسعت نظر، ہندوستان کے خمیر کی آشنا پرستی، وفاداری، رنگ وآہنگ سے اثر پذیری، ترکوں کی مہم جوئی وسپہ گری، افغانوں کی شجاعت وشرافت، مغلوں کے ذوق جمال وقوت ارادی، عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں سب سے مل کر ایک خاص تہذیب وجود میں آئی جس کا نمونہ طبقۂ امرا میں عبدالرحیم خان خاناں، شعرا میں امیر خسرو، اہل دل میں خواجہ نظام الدین (اولیاء) اور علما میں مولانا غلام علی آزاد نظر آتے ہیں، اس تہذیب وثقافت میں تواضع بھی ہے اور حلاوت و مروت بھی، گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، صلابت بھی ہے اور رقت بھی، استقامت بھی ہے اور رواداری بھی، اس کی قلمرو میں علوم شریعت وحکمت بھی ہیں اور ادب و شاعری بھی، فقر ودرویشی بھی ہے، نفاست بھی اور ذوق لطیف بھی، اس کی دل چسپی کے میدان قلعے بھی ہیں اور کتب خانے بھی، مدرسے بھی ہیں اور خانقاہیں بھی، تحقیق وتصنیف کے حلقے بھی اور مشاعرے بھی، ثقاہت بھی اور ظرافت بھی، سخت جانی بھی ہے اور سبک روی بھی، اس کے اظہار خیال اور اظہار کمال کا ذریعہ عربی بھی ہے اور فارسی بھی، اردو بھی ہے اور ہندی بھی، یہ وہ تہذیب وثقافت ہے جس نے فاتحین اسلام کے داخلۂ ہند کے بعد اپنا کام شروع کیا، پھر شاہ جہاں و عالم گیر کے عہد میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی، یہ وہ ہندوستانی تہذیب وثقافت ہے جو نہ خالص ہندوستانی ہے نہ خالص ایرانی نہ عربی ہے نہ عجمی بلکہ ان سب کے محاسن کا مجموعہ ہے اور تہذیب وتمدن کے میدان میں ایک نیا تجربہ یہی تہذیب وثقافت تھی جس کے آخری نمونوں میں یہ ایک نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن شیروانی تھے"۔

(صدر یار جنگ مولفہ شمس تبریز خاں، لکھنؤ ۱۹۷۲ء، باراول، ص ۱۰ و ۱۱)

اس اقتباس میں زبان وبیان کا حسن ہے، اسلامی تاریخ وتہذیب کی تحلیل ہے، اس پس منظر میں جس طرح صدر یار جنگ کا تعارف کرایا گیا ہے وہ بہت موثر ہے، میں وثوق کے ساتھ کہتا

ہوں کہ مولانا کے حسنِ اسلوب کی جلوہ گری دیکھنا ہو تو ان کے مقدموں کو دیکھنا چاہیے، ان میں
مولانا کے متنوع اسلوب بیان کا عمدہ نمونہ ملتا ہے، ان کی زبان کے محاسن ان میں کھل کر سامنے
آجاتے ہیں، چوں کہ مولانا نے مقدمے مختلف موضوعات پر رقم فرمائے ہیں اس بنا پر موضوعات کی
مناسبت سے ان کا اسلوب بھی بدلتا گیا ہے، میں نے تفصیلی بحث اس مقالہ میں سیرت محمد علی مونگیری
اور سیرت صدر یار جنگ کے مقدموں پر کی ہے، مگر ان کا وہ مقدمہ جو انہوں نے گل رعنا پر رقم فرمایا ہے،
اپنی تحقیقی عظمت کی بنا پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس میں انہوں نے محمد حسین آزاد کی آب حیات کی کئی
غلطیاں واضح کی ہیں، اسی طرح مولانا نے جو مقدمہ مولانا محمد حسنی کی عربی کتاب "الاسلام الممتحن"
پر لکھا وہ نہایت عالمانہ اور بہت طاقت ور عربی اسلوب میں لکھا گیا ہے، حتی کہ ایک جگہ خود مولانا
نے لکھ دیا ہے کہ شبہہ اس کا ہوتا ہے کہ مقدمہ کتاب کتاب سے آگے نہ بڑھ جائے، اس مقدمہ
میں مولانا نے مولانا محمد حسنی کے عربی اسلوب کا موازنہ جمال الدین افغانی کے العروۃ الوثقی کے
اسلوب سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ اسی کی طرح ان کا اسلوب طاقت ور ہے جس میں اسلام کی
دعوت پوری جذباتی و استدلالی قوت کے ساتھ پیش کی گئی ہے، مولانا نے جو مقدمہ مولانا محمد رابع
ندوی کی کتاب جزیرۃ العرب پر لکھا ہے وہ بھی قابل ذکر ہے، یہ پڑھ کر تعجب ہوا کہ مولانا کے
بزرگ برادر ڈاکٹر عبدالعلی کی نظر عربوں کے جغرافیہ پر عالمانہ تھی اور کتاب کی تصنیف میں ان کا
مشورہ بھی شامل رہا ہے، جو مقدمہ حضرت نے الثقافة الاسلامية فى الهند مترجمہ مولانا ابوالعرفان ندوی
پر تحریر فرمایا ہے، اس کا اسلوب زوردار نہیں ہے مگر اس میں مولانا سید عبدالحئی حسنی کی مکمل سوانح
حیات، ان کی تصانیف کا تذکرہ اور ان کی کتاب نزهة الخواطر پر عمدہ تبصرہ مقدمہ میں شامل ہے،
بلاغت کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ کلام فصاحت کے ساتھ ساتھ حالات و ظروف سے بھی مطابقت
رکھتا ہو، مولانا علی میاں کے سارے مقدمے بلیغ ہیں، ایک مختصر مقالے میں ان کے تمام مقدمات
کا استیعاب نہیں کیا جا سکتا، جو مقدمہ مولانا عبداللہ عباس ندوی کی کتاب عربی نعتیہ کلام پر تحریر فرمایا
ہے وہ محققانہ ہے، اس میں مولانا نے ان کے آباء و اجداد کے بارے میں عمدہ بحثیں کی ہیں، اس
کے بعد اصل موضوع پر بھی عمدہ تبصرہ ہے، چوں کہ نعت سے مقدمہ نگار کو خاص مناسبت تھی، اس بنا پر
مقدمہ بڑا جان دار ہو گیا ہے۔

بالکل اسی طرح جو مقدمہ مولانا نے ڈاکٹر محمد آصف قدوائی کی کتاب مقالات سیرت پر
تحریر فرمایا ہے اس میں بھی ان کی انشا پردازی اور قوت اسلوب کی جلوہ گری واضح ہے، وہ مقدمہ
بھی نہایت عالمانہ ہے جو علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب سیرۃ النبی ﷺ کی ساتویں جلد پر ہے
اور لکھا ہے کہ میرا مقدمہ لکھنا سید صاحب کی کتاب پر علامات قیامت میں سے ہے، لیکن جو ادبی
مقدمہ مولانا نے خود اپنی کتاب پرانے چراغ پر تحریر فرمایا ہے وہ نہایت دل کش، ادبی اور موثر ہے،
اس مقدمہ سے خود ان خاکوں کی عظمت واضح ہو جاتی ہے، فرماتے ہیں کہ انہوں نے انہیں لوگوں
کے حالات قلم بند کیے ہیں جن سے ان کے قریبی تعلقات تھے، اس بنا پر ان کے خاکے نہایت
کامیاب ہیں، اس لیے کہ ذاتی تعلقات کردار نگاری کی کامیابی کی ضمانت ہیں، پھر مولانا نے جس
دل کش انداز سے اس مقدمہ کو مکمل کیا ہے وہ بھی نہایت ادیبانہ اور دل چسپ ہے، فرماتے ہیں کہ:۔

"'الٰہ دین کا چراغ' کے مشہور قصہ میں پڑھا تھا کہ افریقی جادوگر نے جب
الٰہ دین کا چراغ گم کر دیا اور اس کی بازیافت میں نکلا تو وہ اپنے ساتھ بہت سے چراغ لے
کر چین پہنچا، دروازہ دروازہ صدا لگاتا تھا کہ پرانے چراغ دو نئے چراغ لو، قصہ کا راوی کہتا
ہے کہ جب اس گھر کے دروازہ پر پہنچا جہاں اس کا گوہر شب چراغ موجود تھا تو صاحب خانہ
نے اپنی سادگی میں پرانا چراغ دے کر نیا چراغ لے لیا، اس کو متاع گم گشتہ ہاتھ آ گئی،
مصنف اسی سوداگر کا بھیس بدل کر نئے چراغ بیچتا اور پرانے چراغ خریدتا ہے اور اس
بات پر یقین کرتا ہے کہ وہ اس سودے میں ہرگز نقصان میں نہیں رہے گا اس لیے اس
کتاب کا نام پرانے چراغ رکھا گیا"۔ (پرانے چراغ جلد اطبع چہارم مکتبہ فردوس لکھنؤ ۱۹۹۸ء)

حق یہ ہے کہ مولانا کے مقدمے نور بصیرت کے حامل ہیں، وہ ہمارے اسلامی لٹریچر میں
ستاروں کی طرح بکھرے پڑے ہیں، ان کے اندر جو علوم و فنون کے خزانے ہیں اور ان میں جو
ادبیت اور جامعیت ہے اس کا اندازہ ان کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، جس موضوع پر مقدمہ لکھا
ہے اس علم کا عطر نچوڑ لیا ہے، اگر ان مقدموں کو کتابی شکل میں جمع کر دیا جائے تو اسلامی علوم و فنون
کا عطر مجموعہ تیار ہو سکتا ہے اور ادب و انشا کا اعلیٰ نمونہ سامنے آ سکتا ہے اور اس طرح ان کی اہمیت کا
اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس لیے کہ یہ مقدمے مولانا کے علم و ادب کے ترجمان ہیں

حضرت ذوقی کی فارسی شاعری

از پروفیسر سید وحید اشرف ☆

غلام محی الدین سید عبداللطیف المتخلص بہ ذوقی نہ صرف خانوادۂ حضرت مکان ویلور کی ممتاز ترین ادبی شخصیت تھے بلکہ وفور گوئی کے اعتبار سے فارسی ادب کی پوری تاریخ میں ممتاز ترین شعرا کی صف میں آتے ہیں اور اسی لیے حضرت ذوقی کی شاعری کا مطالعہ فارسی کے طالب علم کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا نظامی، خسرو یا فیضی کے کلام کا مطالعہ، اس مختصر مضمون میں حضرت ذوقی کی قدآور شخصیت کا پورا تعارف ممکن نہیں، اس تحریر کا مقصد ان کی ادبی شخصیت کی صرف چند جھلکیاں پیش کرنا ہے۔

قادری سلسلہ کے اس خاندان کے پہلے شخص سید عبداللطیف قادری بیجاپوری ۱۱۳۸ھ میں ویلور میں مقیم ہوئے اور یہیں ۱۱۴۹ھ میں وفات پائی، بارھویں صدی سے لے کر چودھویں صدی تک اس خاندان کے افراد شریعت و طریقت، حدیث، تفسیر، فقہ کے علاوہ زبان و ادب کی بھی گراں بہا خدمات انجام دیتے رہے ہیں بساتھ ہی خدمت خلق بھی زندگی کا فرض سمجھ کر کرتے رہے۔

ابوالحسن قربی اس خاندان کے سب سے پہلے عالم و صوفی جو فارسی شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے وہ سید عبداللطیف قادری کے فرزند سید ابوالحسن قربی ہیں، یہ نہایت ذہین اور طباع بھی تھے اور ایک بلند پایہ صوفی بھی، ان کے حالات میں ان کے ایک نہایت ذہین اور لایق شاگرد باقر آگاہ نے ایک کتاب تالیف کی ہے جو تحفۃ الحسن فی مناقب ابی الحسن کے نام سے موسوم ہے، اس کتاب میں ابتدا سے لے کر ذوقی تک کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں، حضرت ذوقی، باقر آگاہ کے

☆ عائشہ اپارٹمنٹ، کلیان سوسائٹی، بڑودہ۔

معاصر اور دونوں ہی حضرت قربی کے شاگرد ہیں۔

حضرت قربی کا اردو دیوان چھپ چکا ہے، فارسی دیوان کا ابھی تک پتہ نہیں چل سکا، ان کی چند غزلیں اور ایک قصیدہ باقر آگاہ نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت قربی کی فارسی شاعری اگرچہ تصوف ہی کے مضامین کی حامل ہے لیکن زبان و بیان کی شگفتگی، تغزل کی چاشنی اور قلبی واردات کا برجستہ اظہار ان کے پختہ ادبی ذوق کی گواہی دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے وہ شاگرد جو شاعرانہ ذوق بھی رکھتے تھے خصوصیت کے ساتھ شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوئے، حضرت قربی کی صحبت نے ان کے ذوق کو جلا دی اور ان کی شاعرانہ صلاحیت کی پوری نشو و نما کی، اس دیار میں حضرت قربی کی شخصیت، شریعت، طریقت اور فارسی ادب کے ایک روشن مینار کی ہے جس سے یہاں اس راہ کے ہر رہرو نے رہبری حاصل کی۔

تصوف کے مضامین کو شاعرانہ بانکپن عطا کرنا آرٹ اور فن ہے جس سے حضرت قربی واقف ہیں، ان کے یہاں تصوف سے قطع نظر خالص تغزل بھی پایا جاتا ہے جس سے ان کی طبیعت کی شگفتگی اور فطری ذوق شاعری کا پتہ چلتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض زاہد خشک نہ تھے، فارسی شاعری کے ذریعہ انہوں نے فارسی زبان و ادب کو بھی پروان چڑھایا اور تصوف و اخلاق کی بھی نگہبانی کی، ان کی یہ روش ان کے سلسلۂ طریقت کی توسیع میں بھی معاون ہوئی، معمولی تعلیم یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہر ایک ان کا حلقہ بگوش ہوگیا، ان کی غزل کی دل آویزی ہر ایک کو اپنا گرویدہ کر لیتی تھی، یہاں ان کے اشعار سنانے کا موقع نہیں، ایک غزل کے صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ان کے رنگ کا اندازہ ہو سکے۔

بحمد اللہ سعادت دارم امشب — کہ مہماں شد بت عیارم امشب
رخش گل، چشم نرگس، زلف سنبل — زتاب ایں چمن گلزارم امشب
ز زلف او پس از چندیں شب تار — بدست خویش تارے دارم امشب
شود از دولت آں بخت بیدار — رفیقم بخت و دولت یارم امشب
ز ذوق دیدن آں روی چوں گل — سراپا دیدہ نرگس دارم امشب
دو عالم بر رخش قربی حجاب است — حجاب از پیش او بر دارم امشب

حضرت قربی نے فارسی نثر میں بھی متعدد رسالے لکھے ہیں جن کا تعلق شریعت و طریقت کے مختلف مسائل سے ہے، ان رسالوں سے ان کے روحانی تجربات کا بھی اندازہ ہوتا ہے، ان کی زبان بالعموم صاف اور سادہ ہے، اس دیار میں فارسی شاعری اور ادب کا جب بھی ذکر ہوگا تو قربی کے ذکر کے بغیر ناقص رہے گا، اس خانوادے کے اکثر بزرگ اہل علم و فضل ہوئے ہیں اور ساتھ ہی صاحب تصنیف و تالیف بھی، حضرت قربی کے فرزند حضرت سید عبداللطیف ذوقی نے فارسی شاعری میں جو کمال حاصل کیا وہ بعض اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔

سید عبداللطیف ذوقی کے حالات و کمالات

حضرت ذوقی ۱۱۵۱ھ میں ویلور میں پیدا ہوئے اور صرف ۴۴ سال کی عمر میں ۱۱۹۴ھ میں وفات پائی، اس عرصہ میں ان کی ایک سو پچاس تصنیفات کا ذکر ملتا ہے، یہ شاعری تصوف، تفسیر، عروض، فقہ اور دوسرے موضوعات پر حاوی ہیں، وہ ایک بلند پایہ صوفی تھے اور ریاضت شاقہ کے بعد تصوف میں یہ مقام حاصل کیا تھا، وہ ایک بہترین مدرس، قابل مفسر اور لائق مفتی تھے، وہ روحانی مرشد بھی تھے جن کی ذات سے روزانہ عوام و خواص بھی مستفیض ہوتے تھے، انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، اس کے بعد چودہ یا پندرہ سال کی عمر میں کشتی اور تیر اندازی کی طرف مائل ہوئے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے بعد سولہ سال کی عمر میں پھر پڑھنا شروع کیا، فارسی میں کامل مہارت حاصل کرنے کے بعد عربی پڑھنا شروع کیا اور صرف و نحو، معقول و منقول، عروض اور تصوف میں عبور حاصل کیا، پھر سلوک کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مسند درس و خلافت پر متمکن ہوئے، اس مختصر سی عمر میں اور اتنے کثیر علمی، دینی اور روحانی فرائض انجام دینے کے باوجود ایک روایت کے مطابق انہوں نے تین لاکھ اشعار کا گراں بہا سرمایہ چھوڑا ہے، یہ ایک ایسی غیر معمولی بات ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے، حضرت کے مکان ویلور کے کتب خانہ کا بیشتر حصہ ضائع ہو چکا ہے، بچے ہوئے حصہ ہی کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک نادر کتب خانہ تھا، سینکڑوں کتابوں کے کرم خوردہ اوراق راقم نے دیکھے تھے، اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتابیں کم یاب بلکہ نایاب تھیں، ایسی قیمتی کتابوں کے ضیاع پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے، انہیں ضائع شدہ کتابوں میں ذوقی کی تصنیفات بھی تھیں، راقم کے اندازے کے مطابق ذوقی کا موجودہ شعری سرمایہ چالیس ہزار اشعار پر مشتمل ہوگا، حضرت ذوقی نے اپنی خداداد صلاحیت اور محنت و ریاضت سے علمی، ادبی اور روحانی مرتبہ حاصل کیا کہ باقر آگاہ جیسے مرد آگاہ نے انہیں یگانۂ روزگار کا خطاب دیا۔

حضرت ذوقی کی وفور گوئی، قادر الکلامی اور مختلف علوم و فنون میں درک جس کا اظہار ان کی شاعری میں ہوتا ہے، قدما کی یاد دلاتے ہیں، انہوں نے شعر گوئی میں ان تمام شرائط کی پابندی کی ہے جن کا ذکر نظامی عروضی نے اپنی کتاب چہار مقالہ میں کیا ہے، جس کی ایک شرط یہ ہے کہ شاعری میں قدم رکھنے کے لیے قدما کے دس ہزار اشعار زبانی یاد ہونا چاہیے، نظامی گنجوی کا شرف نامہ ذوقی کے نوک زبان تھا جس کو انہوں نے اس التزام کے ساتھ ازبر کیا تھا کہ ایک سو اشعار روزانہ زبانی یاد کرتے تھے۔

شاہ نامہ اسلام

حضرت ذوقی کا ایک نادر کارنامہ ان کا شاہ نامۂ اسلام ہے جو معجز مصطفےٰ کے نام سے موسوم ہے، یہ سوانح رسول اکرم ﷺ اور غزوات کے ذکر پر مشتمل ہے، اس طرح کی ایک مثنوی مرزا غالب بھی لکھنا چاہتے تھے جس کا نام انہوں نے مثنوی ابر گہر بار رکھا تھا لیکن اس کی تمہید ہی ہو سکی تھی اور یہ مثنوی ناتمام رہ گئی، معجز مصطفےٰ جو مثنوی کی شکل میں ہے تقریباً ساڑھے سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے، ابتدا میں حمد، مناجات اور نعت کے اشعار ہیں، اس نظم میں رزمیہ انداز بھی ہے اور بزمیہ بھی، فلسفیانہ افکار بھی ہیں اور متصوفانہ بھی، واقعہ گوئی بھی ہے اور جذبات نگاری بھی، اس لیے اس مثنوی سے نہ صرف سیرت رسول ﷺ بلکہ شاعر کے مختلف افکار و نظریات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

- یہ مثنوی تیس سال کی عمر میں لکھی گئی اور ڈیڑھ ماہ میں مکمل ہوگئی جیسا کہ خود بیان کیا ہے:۔

متمم شد ایں نامۂ رنج کاہ   بتائید حق در یک و نیم ماہ
در آں وقت کایں نامہ رُخ بر کشود   فزوں تر ز سی سال عمرم بنود

ذیل میں اس مثنوی میں حضرت ذوقی کے صرف بعض افکار اور انداز بیان کے صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں۔

اس مثنوی میں حمد کے اشعار میں زیادہ تر تصوف کے مسائل کا ذکر ہے جس میں نظریۂ وحدۃ الوجود کا اظہار کیا گیا ہے۔

در آں دیدہ کو بنگرد سوے تو بود روے تو پردۂ روے تو

یعنی ہر وہ آنکھ جو تیری طرف دیکھتی ہے اس آنکھ کے لیے تیرا چہرہ ہی تیرے چہرے پر پردہ ہے۔

یہی آواز بازگشت مرزا غالب کے اردو شعر میں اس طرح سنائی دیتی ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

پھر کہتے ہیں۔

مرایں دیدہ کو خلق را بنگرد نخستیں فروغ ترا بنگرد

یعنی خصوصاً ذوقی کی آنکھ جب مخلوق کی طرف دیکھتی ہے تو سب سے پہلے اسے تیرا ہی جلوہ نظر آتا ہے۔

اس طرح کے بہت سے اشعار مختلف انداز میں کہے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شئے میں خدا کا جلوہ موجود ہے اور اسی کے نور سے ہر شئے مستنیر ہے، چند اشعار اور مع ترجمہ ملاحظہ ہوں:۔

جہاں داورا پادشاہی تراست ہم خادم اندو خدائی تراست
اے دنیا کے مالک بادشاہی تیری ہے سب خادم ہیں اور تو مالک ہے

بدیں خوبی افراختی نہ سپہر بر افروختی چہرۂ ماہ و مہر
تو نے اس خوبی سے تو آسمان بلند کیا اور اس میں چاند اور سورج کے چہرے روشن کردیا

توئی کافریدی بدیں آب و رنگ لآلی بدریا جواہر بسنگ
وہ تو ہی ہے جس نے اس آب و رنگ کے ساتھ دریا میں موتی اور پتھر میں جواہر پیدا کردیا

طلا پاشی مہر رخشاں ز تست گہر ریزی ابر نیساں ز تست
چمکتے ہوئے سورج کی طلا پاشی تجھ سے ہے ابر نیساں کی گہر ریزی تجھ سے ہے

ز توفیق تو یافت در وقت کار تن ما تواں و دلِ ما قرار
کام کے وقت تجھ سے توفیق حاصل ہوتی ہے میرے تن کو تواں اور دل کو قرار تجھ ہی سے میسر ہے

رہ تنگ و تاریک نور از تو یافت دلِ دردمنداں سرور از تو یافت
اس تاریک دنیا میں نور تجھ سے پھیلا ہے دردمندوں کے دلوں کو تجھ سے ہی سرور ملتا ہے
(یا تاریک دلوں میں تجھ سے روشنی پیدا ہوتی ہے)

خرد بر جمال تو شیدا بود ز ہر ذرہ مہر تو پیدا بود
عقل تیرے جمال پر شیدا ہے ہر ذرہ سے تیرا مہر ہویدا ہے

چو عالم ہم عکسہای تو شد لقای ہم خود لقای تو شد
جب ساری دنیا تیرا ہی عکس ہے تو سب کی دید تیری ہی دید ہے

دعائیہ اشعار سے بھی حضرت ذوقی کے صوفیانہ ذوق کا پتہ چلتا ہے اس کے بیشتر اشعار طلب معرفت میں ہیں، صرف دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

رہ بادِ من در نوردم ہمہ تو من باشی و من تو گردم ہمہ
اے خدا میری خودی کے راستے کو لپیٹ کر گم کردے یہاں تک کہ تو میں ہوجائے اور میں تو ہوجاؤں

اسی بات کو پھر دوسرے انداز میں کہتے ہیں:۔

می بود تو فانی شود بود من جز ایں نیست مطلوب و مقصود من
اے خدا تیرے وجود میں میرا وجود فنا ہوجائے اس کے سوا میری کوئی طلب نہیں ہے

یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ذوقی کے کمالات نے ان کے بہت سے حاسدین بھی پیدا کردیے تھے جنھوں نے ان کو بہت اذیت پہنچائی تھی۔

ز سرکوبی خست ناکساں اے خدا کمینوں کی کمینگی اور ایذا رسائی سے
بخاک اوفتادم ، بچرخم رساں میں خاک میں پڑ گیا ہوں، تو ہی مجھے بلندی عطا فرما

اس کے بعد نعت اور معراج کے بیان میں اشعار ہیں، معراج کے بیان میں رات کی روشنی، براق کی برق رفتاری اور دیدارِ الٰہی کے ذکر میں جزئیات نگاری اور ایجاز کا مظاہرہ کیا ہے، رسول اکرم ﷺ کی معراج سے واپسی کا ذکر کرتے ہوئے صرف ایک شعر میں پوری شان و شوکت اور کیفیت کا اظہار کردیا ہے، جس سے شعر انتہائی بلیغ ہوگیا ہے، کہتے ہیں:۔

فرود آمد از آسماں بر زمیں قضا در یسار و قدر در یمیں

آنحضرت ﷺ آسمان سے زمین پر اس شان سے واپس آئے کہ آپ کے بائیں ہاتھ میں قضا اور داہنے ہاتھ میں قدر تھی، اس سے اس حدیث کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اللہ مُعطی وانا قاسم۔

واقعات کے بیان کے درمیان نبوت کے فرائض، ہادی کی صفات اور دوسرے فضائل

اور خود اپنے جذبات دروں کا بھی اظہار کرتے جاتے ہیں، اس بات کو کہ جو نبی کی ہدایت کو قبول کر لیتا ہے وہ غم دو جہاں سے نجات پا جاتا ہے، ورنہ قعر غم میں ڈوب جاتا ہے، اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ہر آنکس کہ شد راہِ او ، رُستہ شد　　ہر آنکو نشد آنِ او خستہ شد

حق تعالیٰ جسے سربلندی عطا کرتا ہے وہ دوسروں کو بھی سربلند کرتا ہے اور جس سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے، محرومی اس کا مقدر ہو جاتی ہے، اس بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

کسے را کہ حق برکشد ، برکشد　　از آنکس کہ رو درکشد ، درکشد

اس تجسیم تام اور ایجاز ہونے کے سبب شعر بہت جالب ہو گیا ہے، وہ خستہ دلوں کے لیے مرہم بن جاتا ہے اور دنیا کو رحمت و رافت سے اپنا لیتا ہے۔

شود مرہم خستہ درخستگی　　جہاں را بگیرد بآہستگی

راقم کو یہ خیال آیا کہ نظامی نے جس موقع پر اپنا ایک بلیغ شعر لکھا تھا، اسے حضرت ذوقی نے کس طرح پیش کیا ہے، نظامی کا شعر یہ ہے:۔

چو عنواں گاہِ عالم تاب را دید　　تو گوئی سگ گزیدہ آب را دید

یعنی جب عالم کو روشن کرنے والے کے خط کے مضمون کو شاہ ایران نے پڑھا تو اپنی طاقت کے غرور میں غصہ سے پاگل ہو گیا گویا کسی سگ گزیدہ نے پانی کو دیکھ لیا ہو، اس نے نامۂ مبارک کو چاک کر ڈالا۔

آنحضرت ﷺ نے شاہ ایران کو اسلام کی دعوت دی تھی، پانی کا کام ٹھنڈک پہنچانا ہے، پانی دماغ اور قلب و جگر کی تسکین کا سبب ہوتا ہے، آنحضرت ﷺ کا پیغام روح کے قرار کا پیغام ہے، لیکن جس شخص کو پاگل کتے نے کاٹ کھایا ہو وہ ٹھنڈا پانی دیکھ کر پاگل ہو جاتا ہے، بس یہی حالت رحمت عالم کے پیام رحمت کو دیکھ کر شاہ ایران کی ہو گئی تھی، شاہ ایران کی کیفیت کو نظامی نے ایک تشبیہ مرکب کے ذریعہ نہایت بلیغ انداز میں پیش کیا ہے، حضرت ذوقی نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:۔

پس آں نامۂ نامزد را درید　　نہ نامہ ، جگر گاہِ خود را درید

یعنی شاہ ایران نے نامۂ مبارک کو کیا پھاڑا کہ اس نے خود اپنے جگر کے ٹکڑے کر دیے۔

انسان کے جسمانی نظام کو چلانے کے لیے دل اس کے تمام حصوں کو خون سپلائی کرتا ہے، اسی خون کی روانی پر سارا جسمانی نظام منحصر ہے، لیکن یہ خون خود کہاں سے آتا ہے؟ جگر یہ خون بناتا ہے۔ جسمانی قوت اور بقا کے لیے جسم کے تمام حصے جگر کے محتاج ہیں، شاہ ایران نے خود اپنے جگر کو چاک کر ڈالا یعنی اس نے اپنی سلطنت کے نظام کو خود اپنے ہاتھوں درہم برہم کر ڈالا، یہ کام وہی کرے گا جو اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو یا غرور سے مدہوش ہو یا غصہ سے پاگل ہو، غرور، غصہ اور پاگل پن کی اس کیفیت کے اظہار کے ساتھ جملہ "جگر گاہِ خود را درید" سے اس تاریخی واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جو بعد میں ایران میں پیش آیا اور کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، حضرت ذوقی کے اس شعر میں ایجاز کا پہلو زیادہ ہے، ایک وسیع مضمون کو چند لفظوں میں سمیٹ دیا ہے، اس شعر کے بعد شاعر نے اس جملہ "جگر گاہِ خود را درید" کی مزید تشریح یوں کی ہے:۔

چو بشنید آں شاہِ دنیا و دیں　　کہ زد چاک آں نامہ کسریٰ زکیں
بفرمود کو نامۂ ما درید　　ذرّد ملکِ او را خدائے مجید
چو زینگونہ فرمود شاہِ انام　　بکسریٰ در افتاد کسر تمام

آخری شعر میں الفاظ کسریٰ اور کسر میں تجنیس پیدا ہونے سے شعر کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

غزوات کے بیان میں شاعر کا رزمیہ انداز نمایاں طور پر ابھر آیا ہے، میدان کارزار میں سپاہیوں کا جوش و خروش، کمان کی تان، تیروں کی بارش، گھوڑوں کی ٹاپ اور خنجر و نیزے کی جھنکار اور ان سب کے اثر سے میدان جنگ کی ہیبت ناک تصویر کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے، یہاں صرف جنگ بدر کے بیان میں چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

یکے روز کاندر سواد سپہر　　درخشید از تیغ کہ تیغ مہر
ایک روز آسمان کی سیاہی میں　　تیغ کی جگہ سے سورج کی تیغ نمودار ہوئی
چناں شعلہ زد آتش از ہر کنار　　کہ افتاد در خرمن شب شرار
ہر طرف آگ کے شعلے اس طرح بھڑکنے لگے　　کہ رات کے خرمن میں آگ لگ گئی
رسیدند کفار از ہر طرف　　در آں قاع صف صف کشیدند صف
ہر طرف سے کفار پہنچے　　اور اس میدان میں قطار در قطار صف بستہ ہو گئے

بمیدان دویدند چوں پیل مست — کمانہا بہ مُشت و سنانہا بدست

مست ہاتھیوں کی طرح میدان میں دوڑے — ان کی مٹھیوں میں کمان اور ہاتھوں میں سنان تھی

در آن جنگ آتش بگرد ان فگند — تزلزل بگر دونِ گرداں مکند

اس جنگ میں پہلوانوں میں آگ لگادی — اس جنگ نے آسمان میں زلزلہ پیدا کردیا

(یہاں آگ سے کنایہ پہلوانوں کے جوش و غضب کی طرف بھی ہے اور یہ بھی کہ آتش خنجر سے پہلوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا)

زمیں جوش زد خون گردن کشاں — فرو ماندہ اندر شفق زو نشاں

مغروروں کے خون سے زمین اس قدر پر جوش تھی — کہ شفق اس کے آگے بے نشان ہوگئی تھی

یکے گفت ہاں ، دیگرے گفت ہیں — ازیں ہین و ہاں گشتہ لرزاں زمیں

ایک نے کہا ہاں ، دوسرے نے کہا ہیں — اس ہین وہاں سے زمیں لرزاں تھی

ز ابر کف سروراں بے دریغ — بباریدِ بارانِ پیکاں و تیغ

سرداروں کے ہاتھوں کے ابر سے تیغ و پیکان کی — بارش ہو رہی تھی

ازآں بارش سخت آشوب ناک — ہمی رست صد فتنۂ نو ز خاک

اس سخت آشوب ناک بارش سے زمیں سے — سینکڑوں فتنے اگ رہے تھے

ز بس گرد برخاست از ہر طرف — ز بس آتش کیں برآورد تف

ہر طرف سے بے اندازہ گرد اٹھ رہی تھی — جنگ کی آگ سے بے اندازہ تف پیدا ہو رہی تھی .

چکیدن گرفت آسماں بر زمیں — زمیں شد بجائے سپہر بریں

آسمان زمین پر ٹپکا پڑتا تھا — زمین آسمان پر اٹھ رہی تھی

(یعنی زمین و آسمان تہ و بالا ہو رہے تھے)

ہمہ سنگ پارہ ستارہ شدہ — ستارہ ہمہ سنگ پارہ شدہ

زمیں پر پتھر کے ٹکڑے آگ کا شعلہ بن کر — آسمان پر ستارے کی طرح اڑ رہے تھے

اور آسمان کے ستارے سنگ پارہ کی طرح — ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گر رہے تھے

کواکب بروے زمیں راہ جو — مواکب بچرخ بریں تیز پو

ستارے ٹوٹ کر زمین کی طرف آرہے تھے — اور جنگی گھوڑوں کے جوش و خروش سے معلوم ہوتا تھا

کہ آسمان پر جست لگا رہے ہیں

مندرجہ بالا اشعار میں انداز بیان نے مکمل رزمیہ کیفیت پیدا کردی ہے ، ذیل میں اس رزمیہ کیفیت کا تجزیہ نہایت اختصار سے پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ اشعار میں تجنیس کی صفت رزمیہ تصویر کشی میں بہت معاون ہوتی ہے ، تجنیس کی موسیقیت اور آہنگ طبل جنگ یا جنگی ساز کا کام کرتی ہے ، جیسے اوپر کے اشعار میں گرداں ، گرداں اور گردوں ، ہین وہاں ، کواکب ، مواکب وغیرہ۔

۲۔ ایک ہی کیفیت کو مسلسل کئی شعروں میں مختلف انداز اور مختلف تشبیہات و استعارات میں بیان کرنے سے رزمیہ اثر بڑھ جاتا ہے ، یہ انداز بیان جنگ کی یلغار کی تصویر کشی میں معاون ہوتا ہے مثلاً :۔

چکیدن گرفت آسماں بر زمیں — زمیں شد بجائے سپہر بریں

ہمہ سنگ پارہ ستارہ شدہ — ستارہ ہمہ سنگ پارہ شدہ

کواکب بروے زمیں راہ جو — مواکب بچرخ بریں تیز پو

۳۔ جنگ کا نقشہ کھینچنے کے لیے شاعر تشبیہ و استعارہ کا استعمال کرتا ہے لیکن یہاں تشبیہات مرکب کا استعمال زیادہ موثر ہوتا ہے ، مرکب تشبیہات کے استعمال میں زیادہ شاعرانہ فنکاری اور طباعی کی ضرورت ہوتی ہے ، اس سے شاعر کا کمال زیادہ ابھرتا ہے ، مرکب تشبیہات سے ہر طرح کا کام لیا جاسکتا ہے لیکن اسی موقع پر صرف انہیں تشبیہات کی ضرورت ہوتی ہے جس سے جنگ کی کیفیت کی تصویر کشی ہوتی ہو اور وہ تصویر کشی ایسی ہو کہ قاری یا سامع کی آنکھوں میں پھر جائے۔

۴۔ کبھی کبھی صرف ایک لفظ یا ایک مصرعہ سے مختلف کیفیات کی طرف اشارہ کردیا جاتا ہے ، پھر اس کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں گویا ایک مصرعہ یا لفظ بہت سی تفصیلات کا عنوان بن جاتا ہے ، یہ عنوان جنگ کی تیاری یا مزید آمادگی کی کیفیت کی نشان دہی کرتا ہے ، جیسے اوپر کے شعروں میں یہ مصرعہ : ہمی رست صد فتنۂ نو ز خاک

۵۔ رزمیہ انداز میں مبالغہ سے بھی کام لینا پڑتا ہے لیکن یہ مبالغہ استعاراتی ہوتا ہے، جس کے بغیر شاعرانہ تخئیل کا مکمل اظہار کرسکتا ہے نہ خود اپنے جذبات کی تمام تر وضاحت کرسکتا ہے، یہ مبالغہ شاعرانہ فنکاری ہے اور جز شاعری ہے، رزمیہ شاعری میں اس کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے، یہاں شاعر کی طباعی، جودت ذہن، فنکاری اور پوری قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے، ذوقی کے رزمیہ اشعار اس وصف سے معمور ہیں، مثلاً اوپر کے شعروں میں ''کہ افتاد درخرمن شب شرار'' ''تزلزل بگردون گرداں فگند'' ''چکیدن گرفت آسماں برزمیں'' سے لے کر تینوں اشعار۔

حضرت ذوقی کو اپنی اس مثنوی کی قدر و قیمت کا پورا اندازہ تھا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

عبارات او مایۂ انبساط | اشارات او دادہ جاں را نشاط
خضر در سواد حروفش چو دید | از آں ظلمتش آب حیواں چکید
چو او نیست لعل یگان جہاں | جہانی ز جاں است و جانِ جہان
نگاہی بکن اندریں بحرِ ژرف | کہ ہر قطرۂ اوست دُرِّ شگرف

نظم کو حضرت علیؓ کی مدح پر ختم کیا ہے، حضرت ذوقی فرماتے ہیں کہ مجھے تذبذب تھا کہ یہ نظم مکمل ہوسکے گی یا نہیں، لیکن حضرت علیؓ کی روحانیت نے میری مدد کی اور میں اس کام کو پورا کرسکا۔

بتاسیس ایں روضۂ دل پذیر | نبود اعتمادی مرا بر ضمیر
بتائید کردار والا نژاد | ہمی داشتم روز و شب اعتماد
علی ولی شیر بدخواہ سوز | کہ از رُعب او شد عدو پشت کوز
بمیدان کیں از حُسامِ چو مہر | تپ و لرزہ افگندہ اندر سپہر
زتقبیل درگاہ او ہر سحر | شہِ آسماں را بچرخ است سر
ز گردے کہ از راہِ او خاستہ | فلک دیدۂ انجم آراستہ
من از جان و از دل بدامِ وے ام | غلامِ غلامِ غلامِ وے ام
سر ذوقی خستہ بر خاک اوست | دل و جانِ او بند فتراک اوست

اس مثنوی اور خمسہ کی مثنویوں کے علاوہ حضرت ذوقی نے اور بھی کئی مثنویاں لکھی ہیں، ان میں سے کچھ پائی جاتی ہیں، ان میں مثنوی نامہ خاصی ضخیم ہے جو شاہنامہ فردوسی کی بحر میں ہے، اس

میں انگریزوں کے زمانے میں آرکاٹ کی جنگ کا حال ہے اور آرکاٹ کے جنرل نجیب کے نام پر اس کا نام نجیب نامہ رکھا گیا ہے۔

حضرت ذوقی کے قصائد کے دو مجموعوں کا پتہ چلتا ہے، ان میں سے ایک دیوان راقم الحروف کو مل سکا ہے، اس کی ترتیب ردیف وار حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے، کاغذ اس قدر کرم خوردہ ہے کہ بڑی مشکل سے صرف نقطوں اور شوشوں کی مدد سے راقم نے اس کے متن کی قرأت کی ہے اور پھر اس کا اردو ترجمہ اور حواشی کے ساتھ دار العلوم لطیفیہ کے سالانہ میگزین اللطیف میں بالاقساط شائع ہوا ہے۔

اس دیوان کے قصائد بیشتر خاقانی، انوری، سلمان ساوجی اور عرفی کے قصاید کے تتبع میں لکھے گئے ہیں، اس کا پہلا قصیدہ ۱۲۹۵ اشعار پر مشتمل ہے جیسا کہ قصیدے کے آخر میں اس کی تعداد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لیکن اس میں چند اشعار کم ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ورق یا چند اوراق اس مجلد مجموعہ سے گم ہوچکے ہیں، یہ قصیدہ صرف انیس سال کی عمر میں لکھا گیا ہے جیسا کہ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے:۔

بسالِ یک صد و ہفتاد بر ہزار نمود | بوستانِ جہاں ایں چنیں گل رعنا

یعنی ۱۱۷۰ھ میں یہ قصیدہ لکھا گیا، اس وقت حضرت ذوقی کی عمر ۱۹ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن وہ اس عمر میں وفور گو اور مشاق شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوچکے تھے، اسی قصیدے میں وہ لکھتے ہیں:۔

ز بسکہ لولوے لالا فشانم از خاطر | سحاب می شود از سورتِ حیا شتا
میں اپنی طبیعت سے بے اندازہ روشن موتی بکھیرتا ہوں | جسے دیکھ کر بادل شرم کی شدت سے پراگندہ ہو رہا ہے
منم امیر جہانِ سخن بتاج کمال | چو من رکازِ براعت شدن کرایا را
میں شاعری کی دنیا کا بادشاہ ہوں اور میرے سر پر کمال کا تاج ہے | میری طرح فضل و دانش اور فصاحت و بلاغت کے زر و جواہر کی کان بننے کا یارا کس میں ہے؟
مرا سزاست سخن گفتن و گہر سفتن | کہ نیست در بر ہر مفلسی مہین خارا
شعر کہنا اور لفظ و معنی کے موتی پرونا میرا حصہ ہے | ہر مفلس کو زیب تن کرنے کے لیے قیمتی خارا کپڑا میسر نہیں ہو سکتا

بصدر شعر چو نشینم ، دبیر مکتب چرخ — چو بندہ راست کند پیش من دو دیدہ لنا

جب میں شعر کی مسند پر بیٹھتا ہوں تو دبیر فلک ایک غلام کی طرح میرا جوتا سیدھا کرنے کے لیے میری طرف دوڑتا ہے

چو پیش سنگ گہر می فشانم از خاطر — ز بہر مدحتِ من سنگ می شود گویا

جب میں پتھر کے سامنے اشعار کے موتی بکھیرتا ہوں تو پتھر بھی میری مدح کرنے کے لیے گویا ہو جاتا ہے

پے شنودن شعرم چنان شود مجمع — کہ روز عید شود در میاں شوق منا

میرا شعر سننے کے لیے اتنا مجمع ہو جاتا ہے جیسے منیٰ میں حج کے موقع پر عید کے دن

اگر نگاہ من از مہر تا بد اندر رہ — ہمہ جواہر از ہر شوند سنگ و حصا

اگر میری نگاہ لطف راستہ پر پڑ جائے تو راہ کے سارے پتھر اور سنگ ریزے روشن جواہر میں تبدیل ہو جائیں یعنی شاعری میں معمولی لفظ میرے استعمال سے آب دار بن جاتے ہیں

ز بسکہ خاطر من نور می دہد ہر دم — کے نشد بہ شب تار طالب تارا

میری طبیعت ہر وقت اتنی زیادہ روشنی دیتی ہے کہ اندھیری رات میں کوئی تاروں کی روشنی کا طالب نہیں ہوتا ہے

بخوان دانش من صد چو ہرمس و بقراط — ز راہ گریہ و دریوزہ پر کنند امعا

میرے عقل کے دسترخوان پر ہرمس و بقراط جیسے سینکڑوں مجھ سے عقل کی بھیک مانگتے ہیں

کرا مجال کہ در پیش من سخن گوید — کجا گدازد الماس سخت در احشا

کس کی مجال ہے کہ میرے سامنے سخن گوئی کرے پیٹ میں سخت ہیرا کہاں پگھلتا ہے

انیس سال کی عمر میں حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ شاعری میں ایسا ملکہ حاصل ہونا ایک ایسا نادر الوجود واقعہ ہے جس کی مثال ساری دنیا میں کہیں مشکل ہی سے ملے گی ، شاعر کی اس تعلّی کا سبب بھی غالباً اس کم سنی میں ایسی بے پناہ قادر الکلامی ہے۔

حضرت ذوقی نے اس کم سنی میں شاعرانہ تعلّی کا اظہار کیا ہے، شاعرانہ تعلّی ہر شاعر کا حق تسلیم کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ اس کا مستحق ہو، تعلّی کرتے وقت شاعر اپنے کو ایک آزمائش میں بھی مبتلا

کرتا ہے. یعنی اگر اس کی تعلّی نازیبا ہوئی تو یہی اس کی رسوائی کا سبب بھی بن سکتی ہے اور اس حق کو اس لیے تسلیم کیا گیا ہے کہ کوئی غیور شخص اس رسوائی کو پسند نہ کرے گا، اردو کے شاعر میر نے کہا تھا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اور بڑے بڑے اساتذہ نے اسے تسلیم کرلیا۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب — ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

فردوسی نے کہا تھا ؎ عجم زندہ کردم بہ ایں پارسی یعنی میں نے اپنی شاعری سے عجم کو زندہ کردیا۔

سبھی بڑے شعرا کے وہاں اس قسم کی تعلّیاں ملتی ہیں، حضرت ذوقی نے بھی بجا طور پر اس شاعرانہ حق کا استعمال کیا ہے، لیکن حضرت ذوقی محض شاعرانہ تھے، ابتدا ہی سے ان کا دل مالک حقیقی کی یاد کی طرف مائل تھا، ان کا زیر بحث قصیدہ بھی طلب معرفت اور دام گہ آب و گل سے رہائی کے مضامین سے پُر ہے، انہوں نے شاعری کو روح کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے، انہوں نے اگرچہ شاعری میں اپنے فضل و کمال اور علم و دانش کا زبردست دعویٰ کیا ہے جو بظاہر ایک صوفی کی شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے، لیکن قطع نظر اس کے کہ شاعری میں اس دعوے کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے، انہوں نے اسی دعوے سے ایک ایسا نکتہ پیدا کیا ہے جس سے ان کے اخلاص اور صفائے قلب کا پتہ چلتا ہے، اس سے ان کا بیان نہایت بلیغ ہو گیا ہے اور ساتھ ہی یہ نکتہ دوسروں کے لیے درسِ عبرت بن گیا ہے، وہ اس کا اظہار کرنے کے بعد کہ میں نے علم و فضل میں بڑی شہرت حاصل کی ہے، کہتے ہیں:۔

"شدہ ست لازم عالم چو لفظ را معنا"

یعنی جس طرح لفظ معنی کے بغیر ناقابل تصور ہے اسی طرح عالم کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ اپنے علم کا معانی بن جائے، یہ علم اس وقت بامعنی ہوگا جب عالم اپنے علم پر عمل پیرا ہوگا، اس طرح ذوقی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میرے علم و فضل نے مجھ پر زیادہ ذمہ داری ڈال دی ہے، اسی لیے وہ اس قصیدے کے بہت سے اشعار میں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور خدا سے نیک عمل کرنے کی توفیق طلب کرتے ہیں ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل بھی ہے

قصاید کے اس مجموعہ میں ایک قصیدہ ہے جو ۱۱۴۷ھ میں ۲۳ سال کی عمر میں لکھا گیا ہے۔ تاریخ تصنیف ترکیب "باغ صفا" سے حاصل ہوتی ہے، اس وقت تک ان کی زبان اور انداز بیان میں زیادہ پختگی آچکی تھی، یہ قصیدہ بھی تصوف وعرفان کے مضامین کا حامل ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔

دل من گوے غلطانست، حکم شرع چوگانش   انابت شہسوار تیز و استغفار می دانش

اب وہ اپنا دل شریعت کے ہاتھوں میں دے چکے ہیں اور اپنی رضا کو رضاے الٰہی کے تابع کردیا ہے، اسی لیے کہتے ہیں کہ میرا دل ایک گیند کے مانند ہے، ظاہر ہے کہ گیند اپنے ارادے سے نہیں حرکت کرتا، اس کا متحرک دوسرا ہوتا ہے، حضرت ذوقی کہتے ہیں کہ میرے دل کی گیند کا متحرک شریعت یا حکم الٰہی ہے، ایک سالک کے لیے لازم ہے کہ اپنے ارادے کو ترک کردے اور مالک تعالیٰ کے ارادے کا تابع بن جائے، شارع علیہ السلام سے یہ دعا بھی مروی ہے۔

"اللھم خیر لی واختر لی ولا تکلنی الی اختیاری"

اس قصیدے میں بھی حضرت ذوقی نے اپنے فن شاعری پر اظہار فخر کیا ہے:۔

من آنم کز صہیل ابرش کلک روان من   دہد عرفی عرق از رشک تا گویند قربانش

میں وہ ہوں کہ میرے کلک رواں کے گھوڑے کی آواز سے عرفی کے چہرے پر رشک سے پسینہ آجاتا ہے اور لوگ کہنے لگتے ہیں کہ ذوقی کے اشعار پر قربان ہوجاؤ۔

چو سوے سادہ شد آوازۂ من بہر نظارہ   درآمد پیش چشم اور، درود از جان سلمانش

جب میری شہرت سادہ تک پہنچی تو ذوقی کے سامنے سلمان کی جان سے درود کے کلمات جاری ہوگئے

چو شد از فضل منان ایں گہر از لفظ من ریزاں   صدف شد آب از رشک دُر شہوار غلطانش

جو خدا کے فضل سے میرے لفظوں کے موتی جھڑنے لگے تو میرے دُر شہوار کو غلطاں دیکھ کر صدف شرم سے پانی پانی ہوگیا۔

حضرت ذوقی کے بیشتر قصاید اگرچہ دوسروں کے تتبع میں لکھے گئے ہیں لیکن ان کے اکثر قصیدوں سے ان کی اختراعی صلاحیت، اُپج، مضمون آفرینی، جدت طبع اور تخیل کی بلندی آشکارا ہے، یہاں زیادہ مثالیں پیش کرنا طوالت سے خالی نہیں، صرف چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے، عرفی کا ایک مشہور قصیدہ نعت شریف میں ہے، اسی بحر، ردیف، قافیہ میں حضرت ذوقی نے بھی نعت لکھی ہے اور اپنی

قادر الکلامی اور جدت طبع سے نئے نئے معانی پیدا کیے ہیں یا معانی کو نیا اور دل کش اسلوب عطا کیا ہے۔

از بسکہ دیم یافت زفیضان تو رتبت   ابرے نتواند کہ کشد بار دیم را

بارش کو تمہارے فیض سے وہ مرتبہ ملا ہے کہ بادل کو تاب نہیں ہے کہ بارش کے بار کو اٹھا سکے۔

تا بحر کفت جوش زد از شورش سائل   حاجت بسوے آب نشد ابر و دیم را

سائل کے طلب نے تمہاری ہتھیلی کے سمندر میں وہ جوش پیدا کردیا کہ اب بادل اور بارش کو سمندر سے پانی لینے کی حاجت نہ رہی۔

تا شمع دم خنجر تو تافت، زتابش   خوں ناب بجز دمع نشد چشم دژم را

جب تمہارے دم خنجر کی شمع چمکی تو اس کی تاب سے چشم بد کی آنکھوں سے خون آنسو بن کر گرنے لگے۔

ترسد فلک از ہیبت تو، چون نہراسد   کز نصفت تو پوست کشیدند ستم را

آسمان تمہاری ہیبت سے ڈرتا ہے اور کیوں نہ ڈرے کیونکہ تمہارے انصاف کے سبب ظلم کی کھال کھینچ لی گئی ہے، یعنی جہاں تمہارا انصاف ہے وہاں ظلم کا نام ونشان نہیں ہے۔

حضرت ذوقی کے قصائد حمد، نعت اور منقبت میں لکھے گئے ہیں لیکن ان میں تشبیب کی دل کشی اور مدح کے اشعار میں بھی معنی آفرینی ان کے قصیدے کو وہ شاعرانہ حسن عطا کرتی ہے جس کی وجہ سے ان کے اشعار ادب وفن کا ایسا نمونہ بن گئے ہیں جو ہر اس شخص کے لیے دعوت قلب ونظر کا سامان مہیا کرتے ہیں جو فارسی ادب کا ذوق رکھتا ہے، اس کا تعلق خواہ کسی مذہب یا عقیدے سے ہو، کبھی کبھی وہ بغیر تشبیب کے بھی مدح سے قصیدہ شروع کردیتے ہیں لیکن قصیدے کا معیار باقی رہتا ہے، ایک قصیدہ حضرت عمرؓ کی تعریف میں ہے، اس میں تشبیب کی جدت ملاحظہ ہو، صرف کچھ اشعار نقل ہیں:۔

اگر تابد لب لعل تو بر سنگ   بسان تنگ گردد پُر شکر سنگ
جو تابش پائے تیرے لب سے پتھر   صراحی شکر ہوجائے پتھر
دل سخت تو در پہلو خزیدہ   فگن از بر بزیر اے سیمبر سنگ
ترے پہلو میں بیحد سخت دل ہے   نکال اور پھینک دے پہلو سے پتھر
بجاے لعل بیرون آرد اخگر   زآہ ما اگر یابد خبر سنگ
بجائے لعل چنگاری نکالے   جو میری آہ کو پاجائے پتھر

ہجران تو اے خورشید پیکر شود اندر کف ما سیم و زر سنگ

جدائی میں تری اے ماہ پیکر مرے ہاتھوں میں سیم و زر ہے پتھر

کنم یاد از دلِ سخت تو اے بُت چو می آید مرا اندر نظر سنگ

تری سختی دل یاد آئی فورا نظر میں جب بھی آیا کوئی پتھر

اگر یابد خبر کوہ از دلِ تو سر خود را زند فی الحال بر سنگ

خبر ہو کوہ کو گر تیرے دل کی تو اپنے سر سے وہ ٹکرائے پتھر

فساں باید پئے تیغ شہنشاہ سزا باشد زدل سازی اگر سنگ

ہے تیغ شاہ کو حاجت فساں کی مناسب ہے جو تیرا دل ہے پتھر

فسان اسے کہتے ہیں جس پر تلوار یا دھار دار چیز کو تیز کرتے ہیں اور فسان بھی پتھر ہی ہوتا ہے، معشوق جو عاشق کے اقلیم دل کا بادشاہ ہوتا ہے اور جس کا کام اقالیم دل کو فتح کرنا ہے اس کی تیغ کے لیے فسان کی ضرورت ہے لیکن یہ تنگ کی تیغ ہے اس کے لیے اس نے اپنے دل کو فسان بنالیا ہے تو ٹھیک ہی ہے۔

اوراب گریز کا شعر ملاحظہ ہو:۔

شہ عالم عمرؓ کز فر و سنگش بلرزد عالمی فرسنگ فرسنگ

یعنی حضرت عمرؓ کے جلال و ہیبت سے دنیا کا چپہ چپہ کانپتا ہے، گریز کا شعر جہاں اپنی جگہ فن پارہ بن گیا ہے وہاں اس تشبیب اور قافیہ کی سختی کے ساتھ یہ مضمون آفرینی دامن دل کو کھینچتی ہے۔

طوالت کے خوف سے اب ہم مزید مثالوں سے احتراز کرتے ہیں، یہ مثالیں بطور مشتے نمونہ از خروارے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ قصاید میں بھی ذوقی کا کلام فارسی کے اساتذہ کے کلام کے ہم پایہ ہے، باقر آگاہ نے مثنوی میں انہیں نظامی کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔

ذوقی نے اپنی ہر شعری تصنیف میں اپنی شاعری پر فخر کا اظہار کیا ہے، کچھ مثالیں پیش کی جاچکی ہیں یہاں دو مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں، ایک مثنوی معجز مصطفےٰ سے اور دوسری تاریخی مثنوی نجیب نامہ سے۔

من آنم کہ شکر زبانی کنم بہ نوک قلم دُر فشانی کنم

منم شہر یار جہاں سخن بلند اختر آسمانِ سخن

دُر افشاں چو داما بداماں گیتی ملقب بحسانِ ہند

ہمہ بہرہ مند از نوال من اند ہمہ ریزہ چین مقال من اند

سخن پرورانے کہ بے ہمسر اند مرا در سخن پروری چاکر اند

اور نجیب نامہ میں کہتے ہیں۔

منم تاج دار جہانِ سخن منم خسرو آگہانِ سخن

بخاک درم شود چشمان ہند چو گشتم ملقب بحسانِ ہند

زخوان نوالم ہمہ بہرہ ور زکانِ کمالم جہاں پُر گہر

چو سحر حلالم بر آورد دست بروز از شب تار صد نقش بست

برد آب دریا ز دریاے من گہر کیست مولاے مولاے من

عطارد کشد گرد من در بصر کہ تا در ہنر بابود دیدہ ور

سوادِ سطورم کہ پُرنور شد بصارت ازو دیدۂ کور شد

زفرِ سخن ہر یکے تا مجوست ولیکن سخن را زمن آبروست

حضرت ذوقی نے ۱۱۹۴ھ میں وفات پائی، ان کے معاصر اور ہم سبق اور اپنے زمانے کے زبردست عالم و شاعر باقر آگاہ نے ان کا مرثیہ لکھا اور خراج عقیدت پیش کیا، یہ اشعار حضرت ذوقی کے کمالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جس کی تشریح اور تفصیل دفتروں میں کی جاسکتی ہے، باقر آگاہ نے اسے چند اشعار میں قلم بند کردیا ہے، اس لیے یہاں بھی ان اشعار کو نقل کیا جاتا ہے تاکہ حضرت ذوقی کے کمالات ایک نظر میں قاری کے سامنے آجائیں۔

ذوقی کہ از تراوشِ فیض زبان او گلزار نظم و نثر بہ نشو و نما رسید

خسرو وشے کہ شورِ مئے شکرین او چوں شہرت دبیر فلک جابجا رسید

افراخت چوں قصاید خود را بہ اَوجِ عرش خاقانی و ظہیر بہ تحت الثری رسید

چوں نغمہ سنج شد بغزل، طوطیانِ ہند گفتند ایں نواے غریب از کجا رسید

در مثنوی محیط لبش ریخت چوں گہر گفتند اہل گنجہ کہ رشحے بما رسید

در قطعہ و رباعی و ترجیع بند و فرد فکرش بمنتہاے خیال رسا رسید

چوں دید نثر او دلِ نشگفتہ بہار گفتہ بہ غنچہاے من اکنوں صبا رسید

در منطق و بیان و معانی زنطق او — آسان شدہ بجاے حروف ہجا رسید
ہرکس کہ بنگرد بہ تصوف تصرفش — گوید بہ پیر جام کہ صدر الورا رسید
درماندہ ام بہ دردِ دل خود زمن مپرس — اے داغ ہجرتش کہ بجانم چہا رسید

تاریخ رحلتش چو طلب کردم از سروش
گو ہمدم حکیم نظامی ندا رسید
۴ ۹ ۱ ۱ ھ

باقر آگاہ جیسے نابغۂ روزگار کا اپنے معاصر سے چشمک کے بجائے ان کی عظمت کا اعتراف خود معترف کے اعلیٰ درجہ کی سیرت و کردار کا مظہر ہے۔

شعر العجم مصنفہ مولانا شبلی نعمانی

شعر العجم مولانا شبلی کی سب سے مایہ ناز ادبی و تنقیدی تصنیف ہے، اس سے پہلے اردو میں تنقید کی کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہیں تھی، اس سے اس کمی کی تلافی ہوگئی ہے، یہ اصلاً فارسی شاعری کی تاریخ ہے جس میں اس کے عہد بہ عہد ارتقا کی تفصیل بیان کی گئی ہے، یہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، شروع کی تین جلدوں میں شعر کی حقیقت و ماہیت بیان کرنے کے بعد ابتدا سے تیموری دور تک کے ممتاز اور صاحب کمال شعرا کے حالات اور شاعرانہ خصوصیات تحریر کیے گئے ہیں اور آخر کی دونوں جلدوں میں شاعری کی مختلف انواع و اقسام پر مفصل ریویو کیا گیا ہے۔

شعر العجم کی ایک خوبی اشعار کا حسن انتخاب بھی ہے جو مولانا نے اپنے ادبی و تنقیدی دعووں کے ثبوت میں شعرا کے کلام سے پیش کیے ہیں، ان سے پڑھنے والے کو فارسی شاعری سے دلچسپی اور شعر فہمی کا صحیح اور عمدہ ذوق پیدا ہوتا ہے، مہدی افادی کے خیال میں ''شعر العجم تنقید عالیہ کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے، صرف اردو لٹریچر میں نہیں بلکہ مشرق کی کسی زبان میں اس پایے کی تصنیف موجود نہیں اور یہ دنیا کی سب سے شیریں زبان کے جذباتی لٹریچر کا ایک خوبصورت مرقع ہے''۔

قیمت حصہ اول: ۵۰ روپے۔ حصہ دوم: ۷۰ روپے۔ حصہ سوم: ۳۵ روپے۔
حصہ چہارم: ۴۵ روپے۔ حصہ پنجم: ۳۴ روپے۔

جاہلی تہذیب

از ڈاکٹر عمر فروخ
ترجمہ: جناب اورنگ زیب اعظمی ☆

تہذیب ان عادات واطوار کا نام ہے جن کو کوئی قوم اور ملک عرصہ دراز سے اختیار کیے ہو، جاہلی دور کے عربوں کی بھی اپنی تہذیب و معاشرت اور نظام زندگی تھا۔

دیہات اور شہر میں جاہلی معاشرہ قبائل میں منقسم تھا، قبیلوں میں ایک نسل کے لوگ اور ایک باپ کی اولاد ہوتی تھی، یہی نسل اور خاندانی وحدت ایک قبیلے کے افراد کو اس کے سلسلہ نسب سے پیوستہ رکھتی تھی لیکن بعض اسباب و عوامل سے ان میں افتراق و انتشار بھی رونما ہو جاتا تھا، جن کا تذکرہ سطور ذیل میں کیا جائے گا۔

۱۔ شادی بیاہ: کبھی کسی قبیلے کا ایک آدمی کسی دوسرے قبیلے کی کسی عورت سے شادی کر لیتا اور کبھی ایسا ہوتا کہ ایک عربی کسی غیر عرب قوم کی عورت سے شادی کر لیتا جیسا کہ عمرو بن شداد نے کسی حبشی یا نیگرو لونڈی کو اپنے یہاں رکھ لیا جس سے اس کے یہاں عنترہ نامی اولاد پیدا ہوئی جو جاہلی دور کا ممتاز شاعر تھا، گو عمرو نے عنترہ کے نسبی حقوق سلب کر لیے تھے تاہم وہ عبسی النسب باقی رہا، یہ اس لیے کہ جاہلی دور میں نسب کا ذریعہ صرف باپ ہوتا تھا اور ماں صرف بچے کو پالنے پوسنے والی ہوتی تھی اور اس کا خاندان بچے کی نسل پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا، اسی طرح عبداللہ بن عبدالمطلب کی ماں یمن کے قبیلہ خزرج کی رہنے والی تھیں مگر عبداللہ قریشی رہے، ''الاخبار الطوال'' میں مذکور ہے:۔

"واصاب المسلمون یوم جلولاء غنیمة — مسلمانوں کو جلولاء کی جنگ میں جتنا مال غنیمت ملا

☆ 82/202 غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

لم یغشوا مثلها قط ، و سبوا سبیاً کثیراً من بنات احرار فارس ، فذکروا ان عمر بن الخطابؓ کان یقول ! اللهم : انی اعوذبک من اولاد سبایا الجلو[illegible] فادرک ابناؤهن قتال صفین "(۱)۔

وہ کبھی نہیں ملا تھا اور انہوں نے ایران کی بے شمار آزاد عورتوں [illegible] قیدی بنایا، چنانچہ عمر بن الخطاب کہا کرتے [illegible] "خداوندا! میں جلولاء کی قیدیوں کی اولادوں [illegible] سے تیری پناہ مانگتا ہوں"، چنانچہ انہیں لونڈیوں کے بچے تھے جو صفین کی جنگ میں شامل رہے۔

اس کے باوجود عرب باپوں سے فارسی ماؤں کی اولادیں عرب کہلائیں۔

۲۔ تبدیلی نسب: کبھی ایک آدمی اپنا سلسلۂ نسب ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ میں منتقل کرلیتا ہے، یہ چیز عربوں میں جائز تھی اور ایسا بہت زیادہ ہوتا تھا۔

۳۔ نسب میں شمولیت: کسی قبیلے کے عربی یا غیر عربی غلام سے لوگ اپنی عربی عورتوں سے پیدا ہونے والی بچیوں کی شادی کردیتے اور وہ کچھ زمانے کے بعد ان کے نسب میں آجاتا، کبھی یہ ہوتا کہ کسی عربی کے یہاں اس کی چند غیر عرب لونڈیوں سے بچے پیدا ہوتے اور بسا اوقات ان لونڈیوں کی اولاد کو وہ اپنے نسب میں شامل کرلیتا اور بسا اوقات نہیں کرتا اور کبھی کبھی ایک عربی اپنے نسب میں ناجائز شادی سے پیدا ہونے والے لڑکے کو بھی شامل کرلیتا۔

۴۔ ولاء: کبھی کسی کو اپنی حمایت کے لیے کسی مضبوط قبیلہ کی پناہ میں آنا پڑتا تھا پھر وہ حمایت کرنے والے قبیلہ کا مولی (غلام) بن جاتا اور مرورِ زمانہ سے وہ اس کے نسب میں آجاتا۔

۵۔ معاہدہ: کبھی کبھی دو مختلف قبائل باہم معاہدہ کرکے ایک ساتھ رہنے لگتے تھے، پھر جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا وہ ایک قبیلہ کے افراد ہوجاتے تھے اور کمزور فریق کا نسب طاقت ور فریق کے نسب میں شامل ہوجاتا تھا، علامہ جواد علی لکھتے ہیں:۔

قد اشارت کتب اللغة الی جماعة [illegible] من الموالی و العبید تعربت و استقرت فصارت من العرب ، و کانت

لغت کی کتابوں سے غلاموں کے ایک ایسے گروہ کا پتہ چلتا ہے جو عرب کا باشندہ بنا اور یہیں کا ہو کے رہ گیا پھر وہ عربوں میں شامل ہوگیا جب کہ وہ باہر سے

(۱) ابوحنیفہ احمد بن داؤد دینوری: الاخبار الطوال، ص ۱۲۹، قاہرہ ۱۹۶۰ء۔

منا لرقیق المشتری من الخارج ، وقد ذکروا فی جملة هؤلاء الصعافقة ، وقال علماء اللغة ان آبائهم کانوا عبیداً استعربوا او انهم کانوا قوماً من بقایا الامم الخالیة ضلت انسابهم ، وقد ذکروا ان مساکنهم فی الیمامة فی موضع یقال له صعفوق اوبالحجاز (تاج ۲۰۷/۶) وقد ضاعت انساب جماعات کثیرة غیرهم بامتزاجها بالعرب و دخولها فیهم فصاروا فی عداد العرب الصلحاء ، واوجدوا لهم نسباً هو نسب من اختلطوا بهم و انتسبوا الیهم بالولاء ، قد نسی ذلک الولاء بمرور الزمان وتقادم العهد فاصبح نسباً واصلاً (۱)۔

خریدے ہوئے غلاموں میں سے تھا، اہل لغت نے اس کی مثال میں "صعافقة" کا ذکر کیا ہے جن کے آباء و اجداد غلام تھے پھر عرب میں رہ گئے یا گزشتہ اقوام کے ان باقی ماندہ لوگوں میں سے تھے جن کے نسب کا پتہ نہیں چلتا، علمائے لغت کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ یمامہ میں اس علاقے کے باشندے تھے جو "صعفوق" کے نام سے جانا جاتا ہے یا وہ حجاز کا علاقہ ہے، ان کے علاوہ اور بہت سے گروہوں کا نسب عربوں سے ملنے یا ان میں داخل ہونے کے سبب ضائع ہوگیا پھر وہ اصلی عربوں میں شامل ہوگئے اور اپنا نسب ان لوگوں سے جوڑ لیا جن سے وہ ملے تھے یا غلامی کے سبب ان سے منسوب ہوگئے تھے، زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ان کی غلامی کو لوگ بھول گئے اور یہ غلامی ایک اصلی حسب و نسب میں بدل گئی۔

نسب حقیقت میں طبعی کے بجائے ایک عرفی معاملہ ہے جو قبیلہ کے افراد میں باہمی اعتماد و تعلق کا وسیلہ اور دفع ضرر اور دشمن کو بھگانے کے لیے تعاون کا ذریعہ ہوتا ہے، اسی سے عصبیت پیدا ہوتی ہے (۲)۔

قبیلے کا سردار "شیخ القبیلہ" کہلاتا ہے اور جس کا انتخاب قبیلہ ہی کے معمر افراد میں سے کیا جاتا ہے، وہ قبیلے کے تمام امور کا ذمہ دار ہوتا ہے، شیخ القبیلہ حکمت و تدبیر، بہادری، شجاعت اور مال و نسب میں بھی فائق ہوتا ہے، اس کی ان ہی خوبیوں کی بنا پر اسے "سرداری" کے لیے منتخب کیا

(۱) علامہ جواد علی: المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، ج ۸، ص ۱۹۶، بیروت، ۱۹۶۸ء۔

(۲) علامہ ابن خلدون: مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۲۵، بیروت، ۱۹۶۱ء۔

جاتا ہے، خنساء کا شعر ہے:

كثير الرماد طويل النجاد رفيع العماد ساد عشيرته امردا
يحمله القوم ما عالهم وان كان اصغرهم مولدا

ترجمہ: وہ فیاض اور لمبا ہے اور اچھے گھرانے کا ہے، اس نے اپنے قبیلے کی کم عمری میں سرداری کی۔ لوگ اپنے بار اس پر لاد دیتے تھے گرچہ وہ ان میں سب سے کم عمر تھا۔

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ القبیلہ اپنے قبیلے سے کوئی مال نہیں لیتا تھا بلکہ محتاجوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتا ان کو کھانا کھلاتا، ان کا تاوان ادا کرتا اور جن کاموں کو کرنے سے وہ عاجز رہتے تھے انہیں سر انجام دیتا تھا، وہی جھگڑوں میں حکم ہوتا تھا اور اس کا حکم ہر ایک پر نافذ اور جاری ہوتا تھا۔

شیخ قبیلہ جنگ و صلح میں پیش پیش رہتا تھا، اس کا ترجمان اس کا شاعر ہوتا تھا جیسا کہ عمرو بن کلثوم کے واقعہ سے ظاہر ہے، کبھی کبھی قبیلہ کا کوئی بہادر بھی جنگ میں شیخ قبیلہ کا قائم مقام ہوتا تھا جیسے عنترہ بنی عبس کا سردار نہ تھا مگر وہ اس کا شاعر، شہ سوار مجاہد اور جنگوں میں ان کا قائد تھا، کبھی کبھی قبیلہ کے شعرا اور خطبا بھی شیخ قبیلہ کا بوجھ ہلکا کر دیتے تھے، وہ قبیلے کے کارنامے بیان کر کے اس کا دفاع کرتے تھے اور اس کی ترجمانی کرتے تھے، جیسے حارث بن حلزہ وغیرہ۔

معرکہ کارزار میں شجاعت کا جوہر دکھانے والے لوگ ہی قبیلہ کے ستون اور اس کے تحفظ و بقا کا باعث اور لوگوں کی عزت و ناموس بچانے اور دشمن کے خطرے کے وقت اس کا سہارا ہوتے تھے، اسی لیے جاہلی دور میں میراث ان ہی لوگوں کے درمیان تقسیم ہوتی جو ہتھیار اٹھانے اور میدان جنگ تک جانے پر قادر ہوں، مال غنیمت بھی ان لوگوں میں تقسیم ہوتا جو جنگ میں شریک ہوتے پھر معرکہ کے بعد زندہ رہتے، شہ سوار کو مال غنیمت دو حصہ ملتا، ایک اس کو اور ایک اس کے گھوڑے کو۔

سربرآوردگان اور مجلس دیہات اور شہر کے معاشرہ کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ **قبیلہ یا قوم یا جماعت:** یہ معاشرہ کے لوگوں کی زیادہ تعداد پر مشتمل ہوتی تھی۔

۲۔ **سربرآوردگان:** یہ قوم کے سربرآوردہ، شرفا، شان و شوکت، حل و عقد والے اور اغنیا

ہوتے تھے، اس طبقہ کے لوگ بادشاہ کے مقرب اور درباری ہوتے تھے، بادشاہ ان کی رائے اختیار کرتا اور قوم ان کی اقتدا کرتی اور ان کے احکام کے تابع ہوتی تھی۔

نادی، ندوہ، منتدی اور ندی وغیرہ کلمات ان کی مجالس کے لیے استعمال ہوتے تھے، اس میں لوگ جمع ہو کر ملک یا قبیلہ کے امور پر غور و فکر اور رائے و مشورہ کرتے تھے۔

اہل مکہ کی مجلس کو جیسا کہ روایات میں مذکور ہے "دار الندوة" کہا جاتا تھا، قرآن مجید میں اس کے لیے "نادی" کا لفظ استعمال ہوا ہے، سورۃ العلق میں ابوجہل کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کے اندر نماز ادا کر رہے تھے تو ابوجہل نے آپ ﷺ کو روکا، آپ ﷺ نے اسے ڈانٹ دیا، اس پر ابوجہل نے کہا؟ "تمہیں معلوم نہیں کہ مکہ میں مجھ سے زیادہ مجلس میں بااثر کوئی آدمی نہیں، اگر میں چاہوں تو تیرے خلاف کم بالوں والے گھوڑوں اور بے ریش جوانوں سے اس وادی کو بھر دوں" ابوجہل کی تہدید و وعید میں جو آیات نازل ہوئیں ان میں سے ایک "فَلْيَدْعُ نَادِيَه" بھی ہے۔

طرفۃ بن العبد اس مجلس کو "حلقة القوم" کے نام سے یاد کرتا ہے، اس کا قول ہے:

فان تبغني في حلقة القوم تلقني وان تقتنصني في الحوانيت تصطد

ترجمہ: اگر تم قبیلہ کی مجلس میں مجھے تلاش کرو تو پا جاؤ گے اور اگر تم شراب خانے میں میرا شکار کرو گے تو کر سکتے ہو۔

اس لفظ میں کوئی اجنبیت نہیں کیوں کہ "حلق" بادشاہ کی انگوٹھی کے لیے استعمال ہوتا ہے، مکہ میں قریش کی انجمن کے طرز پر ہر شہر اور ہر قبیلہ میں ایک انجمن ہوتی تھی جس میں سربرآوردہ لوگ شریک ہو کر معاملات طے کرتے تھے، یہ انجمن کسی خاص طرز یا خاص قانون کی پابند نہیں ہوتی تھی۔

انجمن میں شامل اور دخیل ہونے کے لیے خاندانی اہمیت [illegible] جس قدر عالی نسب یا مال دار یا موثر ہوتا تھا اسی حساب سے وہ انجمن میں شامل اور دخیل ہوتا تھا، یہاں تک کہ قبیلے کے معاملات کا تصفیہ بھی کرنے لگتا تھا۔

خاندان کا اثر انجمن کے فیصلے پر بھی پڑتا تھا، سربرآوردہ لوگ جیسا بھی فیصلے کر دیتے تھے اس کے سامنے لوگوں سر تسلیم خم کرنا پڑتا تھا، اس میں سب کے انجمن میں جمع ہونے اور اتفاق کرنے کی نوبت نہیں آتی، اگر کوئی فرد کسی فیصلے سے سرتابی کرتا تو اس کا کوئی ساتھ نہیں دیتا تھا۔

زمانہ جاہلیت میں دیہات اور شہر دونوں جگہ ایسے لوگ ہوتے تھے جن کو انجمن میں شمولیت کا موقع نہیں ملتا تھا کیوں کہ انہیں مادی و معنوی اثر و نفوذ حاصل نہیں ہوتا تھا، اس طرح کے لوگوں کو ان کے لیڈر ضلالت اور گم راہی میں ڈال دیتے تھے، قرآن کریم میں ہے:۔

وَقَالُوْا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا	اور کہیں گے اے ہمارے رب! ہم نے اپنے
وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَ ،	سرداروں اور بڑوں کی بات مانی تو انہوں
رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ	نے ہماری راہ ماری، اے ہمارے رب!
وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا	ان کو دونا عذاب دے اور ان پر بہت
(احزاب: ۶۷، ۶۸)	بھاری لعنت کر۔

جاہلی معاشرے میں آوارہ گرد بھی ہوتے تھے، ان لوگوں سے جب کوئی زیادتی یا غلط کام سرزد ہو جاتا، مثلاً وہ کسی ایسے شخص کو قتل کر دیتے تھے جس سے اوران کے قبیلے میں کوئی معاہدہ یا صلح ہوتی تھی یا پھر انکی آوارہ گردی حد سے زیادہ بڑھ جاتی اوران کی اصلاح کی کوئی امید ہی نہ ہوتی تو قبیلہ اسے نکال دیتا یا اس سے بری الذمہ ہو جاتا پھر دوسرے قبائل بھی اسے قبول نہیں کرتے اور وہ تنگی کی زندگی گزارتا، کثیر العیال ہونے کی صورت میں اس کی غربت اور ناداری زیادہ بڑھ جاتی تھی، امرؤالقیس کہتا ہے:۔

و واد کجوف العیر قفر قطعتہ   بہ الذئب یعوی کالخلیع المعیل

ترجمہ: کتنی ہی ایسی وادیاں میں نے قطع کیا جو گدھے کے پیٹ جیسی اور بے آب و گیاہ تھیں جن میں بھیڑیا ایسے ہی بول رہا تھا جیسے آوارہ گرد زیادہ اولاد والا آدمی بولتا ہے۔

اسی طرح طرفہ اپنی آوارہ گردی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

وما زال تشرابی الخمور و لذتی   و بیعی و انفاقی طریفی و متلدی

الی ان تحامتنی العشیرۃ کلھا   و افردت افراد البعیر المعبد

ترجمہ: میں شراب پیتا رہا، لذت اٹھاتا رہا، خریدتا رہا اور نیا اور پرانا مال خرچ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ پورا قبیلہ میرے پیچھے پڑ گیا اور میں تارکول لگے ہوئے اونٹ کی طرح تنہا رہ گیا۔

دوسری قوموں کی طرح عرب جاہلیت میں بھی غلامی کا عام رواج تھا، غلام قدیم دور میں

اقتصادی زندگی کے ستون تھے، یہ قیدی ہو کر جنگوں میں حاصل ہوتے تھے یا خریدے جاتے تھے۔

جنگ: جاہلی دور میں جنگ زندگی کی ایک عادت بن گئی تھی اور یہ رزق کا ایک ذریعہ بھی تھی، طاقت ور آدمی جب چاہتا اور جس سے چاہتا لڑ بیٹھتا اور جب چاہتا دوسرے کا پانی اور چارہ روک دیتا اسی طرح جب طاقت ور قبیلے کسی گھاٹ پر پہونچتے تو ان کے جانور کم زور قبیلوں سے پہلے پانی پی لیتے، عمرو بن کلثوم کا شعر ہے:۔

و نشرب ان وردنا الماء صفوا   و یشرب غیرنا کدراً و طیناً

ترجمہ: ہم اگر گھاٹ پر پہونچ جاتے ہیں تو صاف پانی پیتے ہیں اور ہمارے علاوہ لوگ گندا اور خاک آلود پانی پیتے ہیں۔

افراد کی کثرت اور ہتھیاروں کی زیادتی قوت و طاقت کی علامت تھی، عمرو بن کلثوم کہتا ہے:۔

ملأنا البر حتی ضاق عنا   وظھر البحر نملاہ سفینا

ترجمہ: ہم نے اپنے آدمیوں سے سطح زمین کو اتنا بھر دیا ہے کہ اب وہ تنگ ہوا چاہتی ہے اور اب سطح آب کو ہم کشتیوں سے بھر دیں گے۔

یہ طاقت دور جاہلیت میں ظلم کی بنا پر قائم رہتی تھی، اس لیے لڑائی کا آغاز طاقت ور ہی کرتا تھا، زہیر کہتا ہے:۔

ومن لا یذد عن حوضہ بسلاحہ   یھدم ومن لا یظلم الناس یظلم

ترجمہ: جو اپنے حوض کی حفاظت خود اپنے ہتھیار سے نہیں کرے گا تو اس کا حوض ڈھا دیا جائے گا اور جو لوگوں پر ظلم نہیں کرے گا تو لوگ اسی پر ظلم کریں گے۔

خاندان: قبیلہ کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں جیسے عشیرہ، بطن، فخذ وغیرہ، خاندان سے مراد وہ معاشرتی وحدت ہے جو شادی بیاہ پر قائم ہے۔

دور جاہلیت میں جو آدمی خاندان کا ستون، مالک اور نسب دار ہوتا تھا، دوسروں کی اولادیں اسی کے نسب سے جا ملتی تھیں، اسی طرح آدمی کو اپنی بیوی اور اولاد کی موت و حیات اور انہیں رہن رکھنے۔۔۔ اور فروخت کر دینے کا حق ہوتا تھا، جنگوں میں لوگ اپنی اولاد دشمنوں کے ساتھ رہن رکھ دیتے تھے جن کو بسا اوقات قتل بھی کر دیا جاتا۔

دور جاہلیت میں شادی بیاہ کے کئی طریقے تھے۔

۱۔ زواج مہر: اس میں ایک مہر پر اتفاق کرلیا جاتا تھا مگر مہر کی رقم عورت کے بجائے اس کے اولیا کو ملتی تھی اور بسا اوقات اولیا اپنی بچیوں کو ان لوگوں سے شادی کرنے کے لیے مجبور کرتے تھے جن کو عورت پسند نہیں کرتی تھی اور بعض اوقات بغیر شادی ہی کے لوگ عورتوں کو رکھ لیتے تھے۔

۲۔ متعہ: آدمی ایک معین مدت کے لیے کسی عورت کو معین رقم دےکر اپنے عقد میں رکھ لیتا تھا جب یہ مدت ختم ہوجاتی تو شادی بھی ختم ہوجاتی، یہ بھی گویا ''زواج مہر'' ہی کے مشابہ ہے مگر اس میں مدت کی شرط ہوتی ہے، اس طرح کی شادی میں مہر پہلے دے دی جاتی ہے اور اولاد کو اپنے باپ سے انتساب اور میراث کا حق ہوتا ہے۔

۳۔ قید کرنا: جب فاتح قوم مفتوح قوم کی عورتوں کو قید کرلیتی تھی تو وہ اس کے تصرف میں آجاتی تھیں، اس میں نہ عورت اور اس کے ولی کی رضا کی ضرورت ہوتی تھی اور نہ عورت کو کوئی مہر دی جاتی تھی۔

۴۔ باندی: ایک آدمی کوئی باندی خریدے اور پھر اس سے اس کے بچے پیدا ہوں تو وہ اسے اور اس کی اولاد کو چاہے آزاد کردے چاہے غلام رکھے۔

۵۔ مال: جاہلی دور میں لوگ اپنی ماؤوں اور اپنے مورثوں کی عورتوں کو اس طرح وراثت میں پاتے تھے جیسے انہیں مال واسباب اور جانور وراثت میں ملتے تھے، اس کے باوجود کہ بچے کو اپنی حقیقی ماں وراثت میں نہیں مل سکتی۔

شادی کی یہی قسمیں جاہلی دور میں رائج تھیں، احصان کا خیال رکھنے کی وجہ سے ان کو شادی کہتے تھے، ان صورتوں میں شوہر اپنی بیوی پر اسی طرح اکتفا کرتا ہے جس طرح بیوی اپنے شوہر پر کرتی ہے، مخادنہ (دوستی کرنا)، مسافحہ (زنا کرنا) اور استبضاع (کسی کو اپنی بضاعت بنالینا) وغیرہ کو بھی شادی کا نام دیا جاتا تھا مگر دراصل یہ سب معاشرے کی غلطیاں اور برائیاں تھیں، اس طرح کی خرابیاں ہر جگہ اور ہر زمانے میں پائی جاتی ہیں، عربوں میں تو اس کی مثالیں شاذ و نادر ہی تھیں جن کا جاہلی دور میں کوئی خاص رواج نہیں تھا۔

نکاح ''شغار'' کا بھی زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا اس طریقۂ نکاح میں دو آدمی جن دو عورتوں

سے نکاح کرتے تھے ان میں ہر ایک کی منکوحہ دوسرے آدمی کی قریبی رشتہ دار جیسے بہن یا لڑکی ہوتی تھی، یہ شادی بغیر کسی مہر کے ہوتی تھی، اسی طرح جمع ''بین الاختین'' کا رواج تھا یعنی ایک ہی آدمی دو سگی بہنوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھتا تھا، اس کے نفسیاتی پہلو کے مدنظر اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہے البتہ اگر کوئی اپنی بیوی کو طلاق دے دے یا اس کی بیوی کی موت ہوجائے تو وہ اس کی بہن سے اگر چاہے تو شادی کرسکتا ہے۔

تعدد ازدواج کا بھی رواج تھا اور قبائل کے اکثر سردار متعدد وجوہ اور سیاسی مصالح کی بنا پر بھی کئی عورتوں سے شادی کرتے تھے، اولاد میں ذکور کو اناث پر ترجیح دیتے تھے کیوں کہ اولاد ذکور جنگ و دفاع میں کام آتی تھی، اور عورتیں جنگی نقطۂ نظر سے غیر مفید اور مردوں پر بوجھ بنتی تھیں۔

اولاد کو خواہ بچے ہوں یا بچیاں اسی وقت زندہ درگور کرتے تھے جب وہ بدصورت اور کریہ المنظر ہوتی یا باپ مسکین اور کثیر العیال ہوتا یا کسی محتاج اور فاقہ زدہ شخص کے صرف بچیاں ہی بچیاں ہوتیں اور وہ ڈرتا کہ جنگ میں ان کی حفاظت و مدافعت نہیں کرسکے گا، فرزدق کو اپنے دادا صعصعہ پر یہ فخر تھا کہ اس نے دور جاہلی میں زندہ درگور کی جانے والی کئی بچیوں کو بچایا تھا۔

اس کا بھی رواج تھا کہ غیر کی اولاد کو اپنے نسب میں شامل کرلیتے تھے اور انہیں وہی سارے حقوق دیتے تھے جو اپنی اولاد کو دیتے تھے، جاہلی دور میں شادی سے بھی زیادہ طلاق کا معاملہ آسان تھا، طلاق کا اختیار مرد کو تھا اور وہ جب چاہتا بغیر کسی سبب کے طلاق دے دیتا، ہاں اگر عورت مال دار یا خوبصورت یا اچھے گھرانے کی ہوتی تو وہ کبھی کبھی یہ شرط لگادیتی تھی کہ طلاق لینے کا حق اسے بھی ہوگا مگر یہ چیز شوہر کے طلاق دینے میں مانع نہیں ہوتی تھی۔

اگر کسی عورت کو طلاق دے دی جاتی یا اس کا شوہر مرجاتا تو اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک متعین مدت گزرنے کے بعد ہی شادی کرے، جاہلی عرب اس مدت (عدت) کے خاتمے کا انتظار اس لیے کرتے تھے کہ ان کا نسب مخلوط اور گڈمڈ نہ ہونے پائے۔

دور جاہلی میں میراث کے حق دار وہی مرد ہوتے تھے جو شہ سوار اور ہتھیار اٹھانے کی طاقت رکھتے تھے چنانچہ بوڑھوں اور بچوں کو میراث میں کوئی حق نہیں ملتا تھا، رہیں عورتیں تو مردوں کو ان سے وراثت ملتی تھی اور وہ خود بھی مال و متاع کی طرح میراث میں ان کو ملتی تھیں لیکن

عورت کو اپنے مرے ہوئے قریبی رشتہ دار کی میراث میں سے کوئی حق نہیں ملتا تھا تاہم اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ بعض قبائل کی عورتوں کو بھی کبھی کبھی میراث میں حصہ ملا ہے۔

دین: لغت میں ''دین'' فرد یا جماعت میں اس جڑ پکڑ لینے والی عادت کو کہتے ہیں جو انفرادی و اجتماعی زندگی میں روکنے والی طاقت بن جاتی ہے، حدیث میں ہے:۔

کان النبی علی دین قومہ (۱)   نبی ﷺ اپنی قوم کے دین پر تھے

یعنی حج، نکاح، بیع وفروخت اور دوسرے طریق زندگی کے متعلق آپ ﷺ کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل سے جو میراث ملی تھی، آپ ﷺ اس کے پیرو تھے، رہی توحید تو اسے ان لوگوں نے بدل دیا تھا اور نبی ﷺ صرف اسی توحید پر تھے جس کے داعی حضرت ابراہیم تھے۔

جاہلی دور کے اکثر عرب اسی دینی فطرت پر قائم تھے، ان کے یہاں اللہ اور عمل صالح کا تصور ملتا ہے مگر سوائے حج بیت اللہ کے عبادت کا کوئی مخصوص طریقہ اس زمانے میں نہیں تھا۔

فطرت کی اس راہ پر وہ اس لیے بھی گام زن تھے کہ ان کے آباواجداد کی بھی یہی روش تھی اس کے نقوش جاہلی شاعری میں بھی ابھرے ہوئے ملتے ہیں، جاہلی عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے وہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا اور ہر چیز پر قابض ہے۔

اصنام واوثان: ''وثن'' ایسے پتھر کو کہتے ہیں جو کسی متعین شکل کا نہ ہو اور ''صنم'' ایسے پتھر یا معدن کو کہتے ہیں جو کسی متعین شکل کا گڑھا یا بنایا گیا ہو۔

بتوں کی پرستش جاہلی عربوں میں ان کی ہم سایہ قوموں کے اثر سے اچانک آ گئی تھی اور یہ بعد کی دین ہے، اس کا ثبوت جاہلی عربوں کا ان بتوں کے بارے میں کم اعتناء کرنا بھی ہے، وہ خاص خاص موقعوں پر ان کا تذکرہ کرتے ہیں، مزید یہ کہ بت ان کے ہاں اللہ کی جگہ نہ حاصل کر سکے جیسا کہ بالخصوص غیر عرب اور غیر سامی اقوام کے ہاں پایا جاتا ہے، بہت سے قبیلوں نے اپنے الگ الگ معبود بنا لیے جیسے لات، منات، عزی، سورج، چاند، شعری، ثریا، ود، سواع اور نسر وغیرہ مگر ان کی عبادت کے بارے میں ان کی دلیل خود ان کی زبان سے قرآن کریم کی سورہ میں آئی ہے:۔

(۱) مجد الدین محمد بن یعقوب فیروزابادی: القاموس المحیط، ج ۴، ص ۲۲۵، مصر، ۱۹۱۳ء۔

أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ . وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى . إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ . إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ (سورۃ الزمر:۳)

یاد رکھو کہ اطاعت خالص کا سزاوار اللہ ہی ہے اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب تر کر دیں، اللہ ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں، اللہ ان لوگوں کو بامراد نہیں کرے گا جو جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔

گو اکثر بت پرست بھی اسے بطور دلیل پیش کرتے ہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ جاہلی عربوں میں بت پرستی رچی بسی ہوئی نہیں تھی، ان کے اشعار بھی اس کے تذکرے سے خالی ہیں، البتہ بتوں کے نام پر نام رکھنے کا رواج تھا جیسے عبد شمس، عبد یغوث، عبد منات، عبد لات اور تیم لات وغیرہ۔

خرافات: دوسری اقوام کی طرح جاہلی عرب بھی بعض خرافات کو دین اور رواج سمجھ کر مانتے تھے۔

خانہ بدوش بدو بادیہ کی طرف اپنے خیموں کو اپنے جانوروں کی پشت پر لاد کر لے جاتے تھے اور انہیں تدمر جیسے ستونوں اور بھاری بھرکم پتھروں اور محلوں والے شہر نظر آتے تو وہ خیال کرتے کہ کوئی انسان اس طرح کے محل نہیں بنا سکتا، اپنی کم زوری اور عاجزی دیکھ کر وہ سمجھتے کہ اس دنیا کے لوگ ہم سے زیادہ قوت اور علم والے ہیں، اس لیے ان کو اجنہ نے بنایا ہے، نابغہ نعمان کی مدح میں کہتا ہے، اس کی تشبیہ ملاحظہ فرمائیں:۔

الا سلیمان اذ قال الالہ لہ   قم فی البریة فاحددها عن الفند

وخیس الجن الی قد أذنت لهم   یبنون تدمر بالصفاح والعمد

ترجمہ: سوائے سلیمان کے جب معبود نے ان سے کہا، اٹھو اور ان کو عاجزی سے الگ کر دو، جناتوں کو قید کر دو، میں نے انہیں حکم دیا ہے وہ تدمر کو پتھروں اور ستونوں سے بنائیں گے۔

جنوں کا ذکر جاہلی شاعری میں کم ہے البتہ یہ زبان وبلاغت کا ایک اسلوب ہے، چنانچہ جب بحتری نے اس تالاب کی تعریف کرنا چاہی جسے خلیفہ متوکل علی اللہ نے سامرا میں بنایا تھا تو

اس کی وسعت وخوبصورتی میں مبالغہ کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

کأن جن سلیمان الذین ولوا ابداعها فادقوا فی معانیها

ترجمہ: گویا کہ سلیمان کے جن ہیں جنہوں نے اس کی تعمیر کا ٹھیکہ لیا ہے چنانچہ انہوں نے اس کی معنویت میں کافی دقت نظر سے کام لیا ہے۔

رہا جنوں کا لوگوں سے کلام کرنا، کبھی کبھی جنگ کرنا اور کبھی کبھی شادی بھی تو یہ سب خرافات میں شامل ہے، اسی طرح بھوت، چڑیل اور عنقا وغیرہ کی باتیں بھی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سی خرافات جاہلی عربوں میں ان کے ہم سایوں اور ان یہودیوں کی وجہ سے پھیلیں جو ان کے بیچ رہنے لگے تھے اور وہ نادانی بھی تھی جو جزیرہ نما کے بہت سے علاقوں میں عام تھی۔

کعبہ: بلاشبہ کعبہ صرف اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا اور وہ کسی دوسرے کی طرف منسوب بھی نہیں کیا گیا، زہیر کہتا ہے:۔

فاقسمت بالبیت الذی طاف حوله رجال بنوه من قریش وجرهم

ترجمہ: پھر میں نے اس گھر کی قسم کھائی جس کا طواف ایسے لوگوں نے کیا جنہوں نے قریش و جرہم میں سے اسے تعمیر کیا تھا۔

نابغہ کہتا ہے: **فلا، لعمر الذی مسحت کعبته ....**

ترجمہ: اس کی عمر کی قسم جس کو کعبہ کے سامنے ذبح کیا گیا۔

اس کے برعکس دین سے فائدہ اٹھانے والے چند لوگوں نے کعبہ پر اور اس کے گرد چند بت نصب کردیے اور جب اسلام آیا تو اس نے کعبہ کو ایک خدا کے گھر کی صورت میں پھر لا کھڑا کیا۔

جاہلی دور کے حج کے رسوم اسلامی دور کے حج کے رسوم سے قریب تھے جیسے طواف، حجر اسود کو بوسہ دینا، عرفہ تک جانا اور آنا، قربانی اور رجم وغیرہ، تاہم دونوں کے درمیان ایک اہم اور بنیادی فرق یہ تھا کہ دور اسلام میں یہ سب چیزیں حقیقی اور مجازی دونوں طرح سے صرف ایک اللہ کے لیے ہوتی تھیں۔

جاہلی دور میں حج کے مہینوں میں تجارتی سرگرمیاں بھی عروج پر رہتی تھیں اور اس سے

وہاں کے باشندے اور خاص طور پر قبائل کے سردار بھی پوری طرح متمتع ہوتے تھے۔

دور جاہلی کے بازار: قبائلی جنگیں حج کے زمانے میں بھی ہوتی رہتی تھیں اس کی وجہ سے بازار بھی بے رونق اور پھیکے رہتے تھے، اسی لیے محترم مہینوں کا وجود ہوا جن کے دوران جزیرہ نمائے عرب میں صلح وامن کی فضا قائم رہتی تھی، یہ محترم مہینے لگاتار نہ تھے بلکہ تین ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم ایک ساتھ پڑتے تھے اور چوتھا مہینہ محرم کے چھ مہینے کے بعد آتا، چوں کہ ان مہینوں میں جنگ وجدال ممنوع تھا جو عداوت ودشمنی کی شدت کو کم کرنے میں معاون ہوتی تھی، حجاز اور نجد وغیرہ میں عربوں کے متعدد بازار تھے مگر سب سے مشہور بازار ''عکاظ'' کا ہے یہ مکہ کے قریب ''نخلہ'' نامی مقام پر ہے۔

کہانت: جاہلی دور میں کاہن بھی ہوا کرتے تھے جن سے سامی اور آریائی قومیں اچھی طرح واقف تھیں، ان کی دینی وسیاسی پوزیشن ہوتی تھی، وہ اللہ سے قربت اور تعلق اور غیب دانی کے مدعی بھی تھے، نجوم وطبابت سے بھی واقف ہوتے، بتوں کے نام پرنذرانے بھی قبول کرتے تھے، عورتیں بھی کاہنہ ہوتی تھیں۔

عرافت، فراست اور قیافہ شناسی: عراف بعض کاموں میں کاہن کے مشابہ ہوتا ہے، وہ ماضی کی پوشیدہ چیزوں کو واشگاف کرتا تھا، یہ طبیب بھی ہوتا بلکہ کہانت کے بجائے طب میں زیادہ مشہور ہوتا مگر وہ مرتبہ میں اس سے کم درجہ کا ہوتا کیوں کہ عرافت کہانت کی طرح کا کوئی دینی منصب نہیں تھا، مشہور عرافوں میں ابلق اسدی، عراف نجد اور رباح بن کحلہ عراف یمامہ ہیں، عروہ بن حزام نے عرافت [illegible] کے ضمن میں کہا ہے:۔

جعلت لعراف الیمامة حکمه — وعراف نجد ان هما شفیانی

فما ترکا من حیلة یعلمانها — ولا رقیة الا بها رقیانی

فقالا! شفاک، والله، مالنا — بما حمّلت منک الصلوع یدان

ترجمہ: میں نے یمامہ کے عراف اور نجد کے عراف کے ہاتھ میں اس کا فیصلہ دے دیا اگر انہوں نے میری شفا کردی، انہوں نے ہر معلوم حیلہ اختیار کرلیا اور ہر تعویذ دے ڈالی۔

پھر کہا: اللہ تمہیں شفا دے، بخدا تیری پسلیوں میں جو کچھ ہے اس کے ہمارے دونوں ہاتھ اہل نہیں۔

عرافوں کی طب دیہاتی طب کے مانند ہوتی تھی جو علم و مطالعہ کے بجائے ذکاوت اور تجربے پر مبنی ہوتی تھی، اس لیے اس میں کبھی غلطی ہوتی ہے اور کبھی تیر نشانے پر لگ جاتا ہے، اس سے بالعموم وہی امراض دور ہوتے ہیں جو نفسیاتی قسم کے ہوں یا بہت ہی معمولی ہوں۔

قیافہ شناسی کا تعلق نقوش قدم کے تتبع کے ذریعہ جاننے اور بھاگنے والوں کے رخ کی معرفت سے ہوتا ہے، قیافہ شناس بعض نقوش قدم کو بعض سے الگ کرتا ہے گرچہ نقوش قدم کتنے ہی باہم خلط ملط ہوں، یہ نقوش قدم ہی کے ذریعہ آدمی کا پتہ لگا لیتا ہے، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جانوروں کے نقوش قدم کو پہچان لیتے ہیں جیسے قیس بن بدر نے جنگ داحس وغبراء میں حذیفہ بن بدر کے گھوڑا ''صارف'' اور حمل بن بدر کے گھوڑا ''حنفاء'' کے نقوش قدم کو پہچان لیا تھا اور ان کے پیچھے چلا یہاں تک کہ انہیں جفر الہبارہ کے پاس دھر لیا۔

اسی سے ملتا جلتا زجر یعنی عیافت ہے، یہ جانوروں اور خاص طور سے چڑیوں کو دیکھ کر یا جانوروں کو ذبح کر کے اور ان کے دل، پھیپھڑا اور آنت وغیرہ پر غور کر کے مستقبل کی باتیں بتانا ہے۔

رہی فراست تو وہ انسان کے چہرے کو پڑھنے کا نام ہے تاکہ وہ ان سے اس کے اخلاق یا نسب کو بتائے کیوں کہ اکثر کسی شخص کے کسی خاندان یا قبیلے سے ہونے میں لوگوں کو تردد ہوا کرتا ہے۔

زمانہ: دور جاہلیت میں لوگ جبری تھے، ان کا اعتقاد تھا کہ زندگی ایک سرسری فرصت ہے اور ہر زندہ کو مرنا ہے کسی کو اس بات کی قدرت نہیں کہ وہ موت کو اپنے سے یا دوسرے سے دفع کر دے اسی کو وہ ''دہر'' یا ''درازیٔ موت'' سے تعبیر کرتا تھا، سورۂ جاثیہ میں جاہلی عرب کا یہ قول نقل ہوا ہے جس پر وعید بھی کی گئی ہے کہ:۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا، نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ، اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ. (سورہ جاثیہ: ۲۴)	اور وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے، یہیں ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو بس گردشِ روزگار ہلاک کرتی ہے اور ان کو اس باب میں کوئی علم نہیں ہے، محض انکل کے تیر چلا رہے ہیں۔

عموماً جاہلی عرب قیامت، جنت اور جہنم پر ایمان نہیں رکھتے تھے مگر زہیر کے یہاں یہ

تصور ملتا ہے اور لبید تو خیر مسلمان ہی ہو گئے تھے، زہیر کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ان ینقص الدھر منی مرۃ لبلی	فالدھر ارود بالأقوام ذو غیر
وان سوف تدرکنا المنایا	مقدرۃ لنا و مقدرینا
ومن ھاب اسباب المنایا ینلنہ	وان یرق اسباب السماء بسلم

ترجمہ: اگر زمانے نے پرانے پن کے سبب ہماری طاقت ختم کر دی ہے تو زمانہ تو لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لینے والا اور مصیبتوں سے بھرا ہوا ہے ہی۔

عنقریب ہمیں اموات آ دھریں گی جو ہمارے لیے مقدر ہیں اور جن کے لیے ہم مقدر ہیں۔

جو موت کے پھندوں سے بچے گا تو وہ اسے پکڑ کر رہیں گے چاہے وہ سیڑھی سے آسمان کی بلندیوں پر ہی کیوں نہ پہونچ جائے۔

زبان اور ادب: سامی زبانوں میں گو عربی سب سے قدیم زبان نہیں ہے تاہم وہ ان کی قدیم زبانوں میں ضرور ہے، اگر اس پر اتنی صدیاں نہ گزری ہوتیں تو وہ لغت کی وسعت، ترکیب کے کمال، تعبیر کی دقت، نثر و نظم کی پختگی اور بلاغت میں اس کی برتری اس حد کو نہ پہونچتی، دراصل سامی اور غیر سامی زبانوں میں کوئی زبان بھی اتنی زندہ، متحرک اور ترقی یافتہ نہیں۔

جاہلی دور کا کلام ضرب الامثال، تقریروں اور کسی قدر تحریروں کی شکل میں موجود ہے اور وہ ایجاز و توازن سے معمور ہے جن میں مسجع کلام بھی پایا جاتا ہے۔

عموماً جاہلی دور کی شاعری دو طرح کی ہے، مالوف اور مخلوف، مالوف کی مثال ''معلقات'' ہیں، ان طویل قصیدوں میں مختلف اغراض اور مشہور و مالوف بنیادی چیزیں بیان کی جاتی ہیں اور قبیلوں کی حمایت اور اعلی اخلاق کا ذکر بھی ہوتا ہے لیکن شعر مخلوف میں اس طرح کے مضامین نہیں ہوتے، اس طرح کے قصائد چھوٹے اور بڑے دونوں طرح کے ہوتے ہیں اور ان میں شاعر اپنے کلام کی اصل غرض و غایت سے آگے نہیں بڑھتا، اس کی اپنی رائے زیادہ مذکور ہوتی ہے، قبیلہ سے کم تعرض کیا جاتا ہے، یہ تمام اشعار وجدانی ہوتے ہیں۔

زمانہ جاہلیت کے عرب خصوصاً بدوی عموماً لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے مگر پڑھائی لکھائی سے وہ یکسر ناواقف بھی نہیں تھے، تاہم اس کا رواج نہیں تھا۔

جاہلی دور کا تمدن: مظاہر فطرت میں جاہلی عربوں کی توجہ اور دلچسپی ستاروں سے زیادہ تھی کیوں کہ خانہ بدوشی اور سفر و سیاحت کی زندگی میں ان کو اس لیے ان سے کام لینا پڑتا تھا کہ ان کے ملک کا اکثر حصہ ان نشانات سے خالی تھا جن سے جگہوں اور راستوں کا پتہ چلتا تھا، چنانچہ انہوں نے ان کا پتہ ستاروں سے لگایا، بنابریں ان کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ ستاروں کے بائے وقوع اور مختلف موسموں میں ان کی حرکت کے دائروں کا علم رکھیں، عربوں نے علم نجوم سے وقت شناسی میں مدد لی، امرؤالقیس معلقہ میں اپنی محبوبہ سے ملنے کا وقت بتاتے ہوئے کہتا ہے:-

تجاوزت أحراساً اليها و معشراً — علىّ حراصاً لو يسرون مقتلي

اذا ما الثريا في السماء تعرضت — تعرض أثناء الوشاح المفصل

ترجمہ: میں اس تک بہت سے چوکی داروں اور ایسے لوگوں سے نظر بچا کر پہونچا جو اس کے خواہش مند تھے کہ وہ چپکے سے میرا قتل کردیں، اس وقت ثریا آسمان میں اس انداز سے جھکی ہوئی تھی جیسے ہار کے یکے بعد دیگرے جواہر کے بیچ کا حصہ مڑا ہوتا ہے۔

سردی کے موسم میں رات کے ابتدائی حصے میں ثریا آسمان کے بیچ میں ہوتی ہے۔

حارث بن ظالم ذبیانی نے اپنے خادم تبیع سے جس کا نام "خراش" تھا، ایک جگہ انتظار کرنے کے لیے کہا تو اسی ضمن میں یہ بھی کہا کہ زہرا نکل آنے تک میں نہیں آسکا تو تم چلے جانا اور جو ملک تمہیں اچھا لگے وہاں چلے جانا۔

جاہلی عرب چاند کو اس لیے زیادہ اہمیت دیتے تھے کہ اس کی روشنی کی زیادتی سے وہ رات میں راہ نمائی اور تاریخ، دن، ماہ و سال کا پتہ لگاتے تھے۔

عربوں کو صرف نمایاں اور زیادہ روشن ستاروں کا ہی علم نہیں تھا بلکہ وہ بہت سے کم روشن اور جھلملانے والے ستاروں سے بھی واقف تھے، جو ٹھیک سے نظر نہ آتے تھے، مشہور مثل ہے "اريها السها فترينى القمر" (میں اسے سہا دکھاتا ہوں اور وہ مجھے چاند) "سہا" ایسا ہی ستارہ تھا جسے صرف تیز بینائی والے ہی دیکھ سکتے تھے اور وہ ان جگہوں میں دکھائی دیتا تھا جہاں کی فضا کم مرطوب ہوتی ہے، یہ مثل اس موقع پر بولی جاتی ہے جب کسی ایسے آدمی کو دقیق اور بہت باریک باتیں بتائی جائیں جو صرف موٹی موٹی باتیں ہی سمجھ سکے۔

زیادہ تر جن آسمانی جگہوں اور ستاروں اور سیاروں کے نام سے جاہلی عربوں کو واقفیت تھی اور جن کے نام پر وہ اپنی اولادوں کے نام رکھتے تھے، یہ ہیں: بدر، قمر، قمیر، ہلال، زبرقان، عطارد، زہرہ، سہیل، ثریا، سماک وغیرہ۔

جاہلی عربوں کو یہ معلوم تھا کہ قمری سال شمسی سال سے چھوٹا ہوتا ہے اس لیے یہ ہر موسم میں اولتا بدلتا رہتا ہے اور کسی خاص موسم میں اس کے مہینے متعین نہیں ہوسکتے، اس سے بچنے کے لیے "نسیٔ" کی اصطلاح ایجاد کی گئی یعنی ہر تین سال میں ایک قمری مہینہ کا اضافہ کردیا جاتا تھا، جاہلی دور میں بعض عرب نسیٔ والے اوقات کا اندازہ لگانے کا کام کرتے تھے، اس کے باوجود وہ نسیٔ کے صحیح اوقات کی حفاظت نہیں کرسکے جس کی وجہ سے جاہلی تقویم درست نہیں رہی۔

طب: جاہلی عرب طب سے بہت اچھی طرح واقف تھے بعض نے ایران و روم وغیرہ جاکر اس کی تحصیل کی اور اپنے ملک کی جڑی بوٹیوں سے اپنے تجربے کے ذریعہ کافی فائدہ اٹھایا، جیسے حارث بن کلدہ ثقفی نے کئی ملکوں کا سفر کیا، ایران میں طب حاصل کی اور وہیں طبابت بھی شروع کی، پھر امراض و ادویہ کا کافی علم و تجربہ حاصل کرکے اپنے وطن واپس آیا، اسی طرح نضر بن حارث ابن کلدہ بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلا اور بعض ملکوں کا سفر کیا، مکہ وغیرہ کے علما سے ملا، احبار و رہبان کی صحبت اختیار کی، علوم قدیمہ کا وافر حصہ پڑھا اور فلسفہ و حکمت کے باب میں واقفیت حاصل کی یہاں تک کہ اپنے والد کے علم طب کا بھی وارث ہوا، جاہلی عرب سرجری اور امراض عین کے ماہر تھے۔

طرفہ بن عبد نے اپنی اونٹنی کی تعریف میں ۳۶ اشعار کہے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے ضرور جانوروں کی تشریح و جراحی کے اہم معاملات سے واقفیت بہم پہونچائی ہوگی، جیسے اس نے اونٹ کی کھوپڑی کو سندان سے تشبیہ دی ہے، اسے یہ معلوم تھا کہ کھوپڑی مختلف قسم کی ہڈیوں سے مل کر بنی ہوتی ہے اور یہ ہڈیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں کیوں کہ ان کے کنارے کنگن کی طرح دانت دار ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے ان کا اتصال و دخول ہوتا ہے، اسی طرح اس نے دل کو پتلا، گول، توڑنے والے پتھروں کی طرح سخت، ملفوف اور آسمان میں معلق کہا ہے، وہ کہتا ہے:-

و جمجمة مثل العلاة کانما   وعی الملتقی منها الی حرف مبرد

و اردع نباض احذ ململم   کمرداة صخر فی صفیح مصمّد

ترجمہ: کھوپڑی سندان کی طرح ہے اس کے ملنے کی جگہیں اس طرح جڑی ہوئی ہیں جیسے درانتی کے کنارے اور ایک دھڑکتا ہوا تیز، دائرہ نما اور آسمان میں سخت توڑنے والے پتھر کی طرح کا دل......

یہ دقیق باتیں کسی عام اور سرسری مشاہدہ کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں ہیں بلکہ کسی عقل مند کے مشاہدہ، جربہ اور دقیق مطالعہ ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہیں جس کو شعر سے زیادہ علم طب سے واقفیت ہے۔

خالص فلسفہ: جاہلی اشعار میں فلسفیانہ خیالات بھی ملتے ہیں، جیسے حارث بن حلزہ نے اپنے شعر میں "حدس" (تاڑلینا) کے باب میں کہا ہے:۔

فحبست فیھا الرکب أحدس فی   کل الأمور، و کنت ذا حدس

ترجمہ: میں نے وہاں سواروں کو روک لیا کہ تمام معاملات کو اچھی طرح سمجھ لوں اور میں تاڑ لینے والا ہوں۔

طرفہ بن عبد کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک زندگی عیش و تنعم اور لطف و لذت کا نام ہے، مثلاً:۔

فلولا ثلاث ھن من لذة الفتی   وجدک لم أحفل متی قام عودی

فمنھن سبقی العاذلات بشربة   کمیت متی تعلّ بالماء تزبد

و کرّی اذا نادی المضاف مجنبا   کسید الغضا، نبھته، المتورد

وتقصیر یوم الدجن، والدجن معجب   ببھکنة تحت الخباء المعمّد

فذری أروّی ھامتی فی حیاتھا   مخافة شرب فی الممات مصرّدٖ

وذرنی و خلقی، انی لک شاکر   ولو حلّ بینی نائیاً عند خرعذ

و قالوا! ألا ماذا ترون بشارب   شدید علینا بغیه متعمد

فقالوا! ذروہ، انما نفعھا لہ،   و الا تردوا قاصی البرک یزود

ترجمہ: اگر تین چیزیں نہ ہوں جو نوجوان کی لذت کا سامان ہیں تو میں اپنے زائرین کی آمد کی پروا نہ کروں۔

ان میں سے ایک برا بھلا کہنے والیوں سے پہلے ہی ایک کمیتی شراب کا گھونٹ ہے جو پانی ملانے

سے جھاگ دار ہو جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ جب کوئی پناہ گزیں جھک کر پکارے تو میرا حملہ صحرائے نجد کے ایسے شیر کی طرح ہوتا جو پانی پینے جا رہا ہو اور تم اسے چھیڑ دو۔

تیسرا یہ کہ بدلی کے دن کا کم ہونا اور بدلی کا دن کس قدر خوش گوار اور لطف کا ہوتا ہے جو خیمے کے نیچے کسی گانے والی کے ساتھ بسر ہو رہا ہو۔

تو مجھے چھوڑ دو میں اپنی "ہامہ" کو اپنی زندگی ہی میں سیراب کردوں، ڈر ہے کہ کہیں موت میں اسے ٹھنڈا پانی نہ ملے۔

مجھے بری عادت پر چھوڑ دو، میں تمہارا شکریہ ادا کروں گا : چاہے میرا گھر دور خرعذ کے پاس ہی کیوں نہ ہو جائے۔

لوگوں نے پوچھا! سنو، تمہاری ایک ایسے پینے والے کے بارے میں کیا رائے ہے جس کا پانا ہمارے لیے مشکل ہے۔

تو لوگوں نے کہا! اسے چھوڑ دو اس کا نفع اس کو ملے گا اگر تم دور تالاب والے آدمی کو لوٹا نہیں پاؤ گے تو وہ دور ہی ہوتا جائے گا۔

گویا طرفہ کے نزدیک انسان کی لذت شراب، ضیافت اور عورتوں کے ساتھ لطف و تفریح میں ہے، وہ ان تمام چیزوں سے زندگی ہی میں لطف اندوز ہو لینا چاہتا ہے، کیوں کہ موت کے بعد یہ چیزیں ملنے والی نہیں، وہ کہتا ہے:۔

کریم یروّی نفسه فی حیاته   ستعلم ان متنا غدا أینا الصدی

ترجمہ: فیاض اپنے نفس کو اپنی زندگی ہی میں سیراب کرتا ہے، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ موت کے بعد کون آواز لگائے گا۔

غرض طرفہ اسی راہ پر چلنا پسند کرتا ہے خواہ لوگوں سے اسے دور ہی کیوں نہ رہنا پڑے، اس کا یہ بھی خیال ہے کہ لعنت ملامت سے آدمی کے اندر ضد پیدا ہوتی ہے، اس کے علاوہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا،

اخبار علمیہ

ماہرین امراض نے ایک سال میں ۱۵ رملین (ڈیڑھ کروڑ) نئے کینسر کے کیسز سے اندازہ لگایا ہے کہ ۲۰۲۰ء تک اس کی عالمی شرح میں پچاس فی صد اضافہ ہوسکتا ہے البتہ ان کے خیال میں ایک تہائی کا علاج پیشگی تدارک واحتیاط اور رہن سہن میں مناسب تبدیلی کے ذریعہ ہوسکتا ہے، اس خطرناک بیماری نے اب مغربی ممالک کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا ہے، ترقی یافتہ اور صنعتی ملک ہونے کے باوجود ان ملکوں کے زیادہ تر لوگ اس بیماری سے ہلاک ہورہے ہیں، ایک اندازے کے مطابق ایک چوتھائی سے زیادہ موتیں کینسر کی وجہ سے ہورہی ہیں۔

ورلڈ کینسر رپورٹ کے مطابق یہ بات سامنے آئی ہے کہ پوری دنیا میں ہر سال پیش آنے والے دس ملین (ایک کروڑ) کیسز میں پیشگی تدارک واحتیاط کے عمل سے ایک تہائی کمی ممکن ہوسکتی ہے، اس رپورٹ کے معاون ایڈیٹر ڈاکٹر برنارڈ اسٹیورٹ کا خیال ہے کہ اگر اب بھی کینسر کے بڑھتے ہوئے قدم کو نہیں روکا گیا تو ۲۰۲۰ء تک پچاس فی صد لوگوں میں یہ بیماری سرایت کر جائے گی، انہوں نے کہا کہ پیشگی احتیاطی تدبیروں سے ایک تہائی کینسر بیماری سے بچا جاسکتا ہے۔

انٹرنیشنل ایجنسی فار ریسرچ آن کینسر جو ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کا ایک حصہ ہے کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہر سال پوری دنیا میں ۶ رملین (۶۰ لاکھ) افراد جو اس موذی مرض میں مبتلا ہوکر اپنی جان کھودیتے ہیں وہ جسمانی بدعنوانیوں اور سگریٹ اور تمباکو نوشی کے سبب یہ خطرہ مول لیتے ہیں، رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمباکو کا اتلاف اور اس کے استعمال پر پابندی کینسر سے بچاؤ اور حفاظت کی سب سے اہم تدبیر ہوسکتی ہے، منشیات کا استعمال کرنے والے ۲۰ر۳۰ سے زائد بار اپنے پھیپھڑے کو کینسر کی دعوت دیتے ہیں، مزید برآں اس سے جگر، گردے، پیٹ اور زبان میں سوراخ

ہوجانے کا احتمال بڑھ جاتا ہے جس سے کینسر کی بیماری ہوسکتی ہے۔

ماہرین صحت نے کینسر سے متاثر اموات کی شرح میں زبردست اضافے کی پیشین گوئی کی ہے اور آگاہ کیا ہے کہ آنے والی دہائیوں میں تمباکو اور سگریٹ نوشی سے ہونے والی بیماریوں کا علاج وقت کا سب سے اہم تقاضا ہوگا، رپورٹ میں کہا گیا ہے وہ لوگ جو جگر کے ورم وسوزش میں B اور C وائرس اور جگر، گردن اور پیٹ سے تعلق رکھنے والی بیماریوں سے متاثر ہیں ان پر بھی کینسر کا حملہ ہوسکتا ہے تاہم خورد ونوش میں پھلوں اور سبزیوں کا زیادہ استعمال، ورزش میں کثرت اور دوسری بیماریوں کی احتیاطی تدبیر سے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

NGRI (National Geophysical Research Institute) کے سائنس دانوں نے قدیم حیدرآباد کے علاقے ٹولی چوکی کے دو کنوؤں میں تقریباً دس ہزار سال پرانا پانی دریافت کیا ہے، ان کنوؤں کی گہرائی ۱۳۵ اور ۱۴۱ میٹر ہے، اتنے طویل عرصے تک ان میں ابھی تک پانی کے ختم نہ ہونے اور پانی کی صورت میں برقرار رہنے کے اسباب کا پتہ لگانے والے سائنس دانوں کی اس ٹیم میں بی۔ ایس۔ سکھیجا، وی ریڈی اور پی ناگا بھوشانن شامل تھے، اس پروجیکٹ کے تحت ۶۰ ر سے زائد کنوؤں کے پانی کے جو نمونے اکٹھا کیے گئے ان میں ٹولی چوکی کے پانی کی خصوصیت بالکل الگ تھی اور ان کے قیاس کے مطابق ٹولی چوکی کے دونوں کنوؤں کا پانی سب سے پرانا ہے، انہوں نے اپنی تحقیق میں بتایا کہ اس کی کلائمیٹ (آب وہوا) دس ہزار سال پہلے کی ہے اور اس کی رطوبت اور نمی ہی ابھی تک اس کو پانی کی صورت میں برقرار رہنے کی ذمہ دار ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جیالوجی (ارضیات) ڈپارٹمنٹ کی طرف سے منعقدہ دو روزہ کانفرنس میں شریک ہونے والے ماہرین ماحولیات اور سائنس دانوں نے تشویش ظاہر کی ہے کہ ہندوستان میں پانی کا ۹۰ رفی صد حصہ بدانتظامی کے سبب ضائع ہوجاتا ہے، انہوں نے متنبہ کیا ہے کہ اگر اس بدانتظامی کو دور کرنے کے لیے فوراً قدم نہیں اٹھایا گیا تو ملک کے پانی کی سطح تیزی سے گھٹ سکتی ہے، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ بارش کے پانی کا جو دس فی صد حصہ دست یاب بھی ہوتا ہے، اس کا ۷۰ رفی صد حصہ آلودہ اور ناقابلِ استعمال ہوتا ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے انل کمار مشرا نے اپنے مقالہ میں اس بات کا اظہار کیا کہ لکھنؤ کے لوگوں کے روزمرہ پانی کے استعمال کی ضرورتیں گومتی ندی سے پوری ہوتی ہیں اور گندے نالوں کے پانی کی آلودگی کے سبب اس ندی کے سطح آب کے تیزی سے گھٹنے اور نیچے جانے کا مسئلہ بھی قابل غور بنتا جارہا ہے۔

کانفرنس کے کنوینر ایس۔ ایچ اسرائیلی نے کہا کہ ملک کے مختلف حصوں سے تقریباً ۱۰۰ر مندوبین نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

امریکہ کے اگریکلچرل ڈپارٹمنٹ اور اسرائیل کے سائنس دانوں نے انکشاف کیا ہے کہ حیوانوں کی طرح پودوں (نباتات) کے پاس بھی حیاتی گھڑی ہوتی ہے جو انہیں بیدار کرتی ہے، اوتار، کے، متو اگریکلچرل ریسرچ سروسز لیب ڈپارٹمنٹ میں نباتات کے ماہر عضویات کے بیان کے مطابق پودوں کے پاس بھی کوئی ایک چیز ایسی ضرور ہے جو انہیں سورج سے گرمی اور فائدہ اٹھانے کے لیے تیار کرتی ہے۔

نظام شمسی کے تحت سورج کے اردگرد چکر لگانے والے معروف و مشہور سیاروں کی تعداد ۵۸ر ہے، ان کے علاوہ مشتری کے مدار کے مخالف سمت میں سائنس دانوں نے ۶ر چاند دریافت کیے ہیں، یونیورسٹی آف ہوائی کے ڈیوڈ جیوٹ اور اسکاٹ شیپرڈ نے جن کا تعلق جان کلینا آف کیمبرج یونیورسٹی سے ہے اس کا انکشاف کیا ہے، انہوں نے کہا کہ یہ چھوٹے چھوٹے چاند غالباً ایک میل یا اس سے کچھ بڑے ہوں گے اور مشتری سے دسیوں ملین کے فاصلے پر ہیں اور اس کے مخالف سمت میں چکر لگاتے ہیں، خیال ہے کہ یہ چاند مشتری کے زوردار جھٹکے کے سبب الگ ہوئے ہوں گے، جیوٹ کی ٹیم نے اس سال مشتری کے اردگرد ۱۸ر چاند دریافت کیے ہیں ان کے خیال میں یہ تعداد اور زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔

(ماخوذ: ٹائمس آف انڈیا)

ک۔ص۔ اصلاحی

معارف کی ڈاک

اظہار تشکر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔
۷راپریل ۲۰۰۳ء

محترم جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب! السلام علیکم!!

شبلی اکیڈمی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ۹ رکنی وفد کے دو روزہ قیام کے دوران آپ نے اس وفد کی جس طرح کی پذیرائی اور مہمان نوازی کی، اس کے لیے یہ ادارہ آپ کا اور شبلی اکیڈمی کے دیگر کارکنان کا دل کی گہرائیوں سے اظہار تشکر کرتا ہے، مجھے خوشی ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ وفد اعظم گڑھ گیا تھا اس میں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی، آج کے صارفین کلچر میں آپ علامہ شبلی نعمانی کی روایات کو نہ صرف جاری رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس کو پروان بھی چڑھا رہے ہیں۔

ایک مرتبہ پھر میں شبلی اکیڈمی میں اپنے دو روزہ قیام کے یادگاری لمحات پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مخلص
نسیم احمد (وائس چانسلر)

خُمرہ کا صحیح ترجمہ

جنے نگر مدرسہ، نیل باغان،
نوگاؤں، آسام

محترم المقام! جناب مولانا اصلاحی صاحب، اڈیٹر رسالہ "معارف" اعظم گڑھ۔
زید مجدہ...... السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

گرامی قدر!
آپ کا مؤقر رسالہ "معارف" بابت ماہ مارچ ۲۰۰۳ء موصول ہوا، اس کے تمام مقالات حسب سابق قابل قدر، معلومات افزا، علمی اور تحقیقی ہیں، اسی شمارہ میں ایک مقالہ "حضرت ام ایمن

رسول اکرم ﷺ کی انا'' کے عنوان سے بھی شائع ہوا ہے، جس کے مقالہ نگار جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی صاحب ہیں، یہ مقالہ جیسا کہ خود انہوں نے لکھا ہے ''اوپر جو کچھ جمع کرکے پیش کیا گیا ہے، وہ تنکہ تنکہ اکٹھا کرکے آشیاں بنانے کے برابر ہے'' کا واقعی مصداق ہے، مگر اس کے باوجود اس میں ان سے ایک جگہ یہ چوک ہوگئی ہے کہ انہوں نے ''خمرہ'' کا ترجمہ ''اوڑھنی'' کردیا ہے، حالاں کہ یہ اس کا ترجمہ نہیں، بلکہ اس کا صحیح ترجمہ ہے ''کھجور کی چھوٹی چٹائی'' دیکھیے! آں محترم ''روایت حدیث'' کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

''دوسری طبرانی کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے مسجد سے حضرت ام ایمن کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اوڑھنی دے دو تو انہوں نے حائضہ ہونے کے عذر کو پیش کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا حیض ہاتھ میں نہیں ہے۔'' ...... قالت ام ایمن قال رسول الله ﷺ : ناولینی الخمرة من المسجد، قلت : انی حائض، قال : ان حیضتک لیست فی یدک''۔

بخاری شریف میں ''کتاب الصلوۃ'' کے تحت ایک ''ترجمۃ الباب'' ہے ''باب الصلوۃ علی الخمرہ'' اس کے ذیل میں اس کے مؤلف حضرت امام بخاریؒ نے ایک روایت تخریج کی ہے، جس کا متن یہ ہے۔

''عن میمونة قالت : کان النبی ﷺ یصلی علی الخمرة'' (ص ۵۵، ج ۱)، محشی بخاری حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ نے اس کے معنی یوں بیان کیے ہیں۔

''الخمرة سجادة صغیرة تعمل من سعف النخل و ترمل بالخیوط'' (ص ۵۵، ج ۱)، بخاری شریف کے مشہور شارح علامہ بدرالدین عینیؒ نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں۔

''وکل واحد من الحصیر و الخمرہ تعمل من سعف النخل و یسمی سجادة'' (عمدۃ القاری، ص ۱۰۹، ج ۴)۔

بہرحال ان تصریحات اور حوالہ جات سے صاف ظاہر ہے کہ ''خمرہ'' کے معنی اوڑھنی نہیں، بلکہ ''کھجور کی چٹائی'' ہیں، ایسا لگتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار کو ''خمرہ'' اور ''خمار'' میں التباس ہوگیا، جس کی بنا پر ان سے یہ قلمی چوک ہوگئی اور انہوں نے ''خمرہ'' کے معنی اوڑھنی لکھ دیے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اور پروفیسر ضیاء الحسن صاحب ندوی جیسی علمی شخصیات کا سانحۂ وفات واقعی افسوس ناک ہے اللہ تعالیٰ امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔

اللہ کرے! آپ بخیر و عافیت ہوں، دعوات صالحہ میں یاد رکھیں۔ فقط والسلام

آپ کا مخلص مظہر الاسلام قاسمی

ادبیات

تکبیر مسلسل

از جناب انتظار نعیم صاحب☆

بغداد نہیں عالمِ اسلام پہ ہے وار
محشر ہے بپا، ملتِ خوابیدہ ہو بیدار

ٹوٹی ہیں تری شمع پہ مغرب کی ہوائیں
ہر موڑ پہ اک جنگ ہے ہر سمت بلائیں
ہر گوشۂ آفاق سے آتی ہیں صدائیں
بیدار ہو، بیدار ہو، بیدار ہو، بیدار
بغداد نہیں عالمِ اسلام پہ ہے وار

باطل نے فلسطین پہ کیا ظلم نہ ڈھایا
کابل کی زمینوں کو بھی ویرانہ بنایا
اقوام جہاں کو بھی یہ خاطر میں نہ لایا
ہے کبر کے جذبے سے بھرا وحشی و خونخوار
بغداد نہیں عالمِ اسلام پہ ہے وار

کم ظرف اٹھا سوئے عرب آگ لگانے
خوابوں میں لیے مشرقِ وسطیٰ کے خزانے
مکہ کو مدینہ کو زمانے سے مٹانے
ہے امن کا پرچم بھی اٹھائے ہوئے مکار
بغداد نہیں عالمِ اسلام پہ ہے وار

یہ عدل کا انصاف و شرافت کا ہے دشمن
کردار کا اخلاق کا غیرت کا ہے دشمن
ہر پاک و درخشندہ روایت کا ہے دشمن
اس مفسد و مغرور پہ اللہ کی پھٹکار
بغداد نہیں عالمِ اسلام پہ ہے وار

☆ 2525، بارہ دری، بلیماران، دہلی ۶۔

ہر سمت اٹھے نعرۂ تکبیر مسلسل   سر لے کے ہتھیلی پہ چلیں جانب کربل
دشمن کی ہی لاشیں ہوں تو دشمن کا ہی مقتل   بن جاتا ہے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار
بغداد نہیں عالم اسلام پہ ہے وار

یلغار! کہ ظالم یہ زمیں چھوڑ کے جائے   یلغار! کہ بھاگے تو پھرے منہ کو چھپائے
یلغار! کہ دنیا سے مٹیں ظلم کے سائے   یلغار! ہو ہاتھوں میں دعا کا لیے ہتھیار
بغداد نہیں عالم اسلام پہ ہے وار

غزل

از جناب رئیس احمد نعمانی صاحب☆

کس کے کام آتی مرے عہد زبوں کی میراث   بیچ دی بچوں نے آخر مرے خوں کی میراث
یہ سیاست، یہ حکومت، یہ تماشاگہ زیست   شعبدہ بازوں کے نیرنگ و فسوں کی میراث
بوسنی، کابل و کشمیر سے بغداد تلک   غافلو! کس کے ہے یہ بخت نگوں کی میراث
مل گئیں خاک میں سب نیکی بدی کی قدریں   اب نہ باقی ہے خرد کی نہ جنوں کی میراث
آہ! یہ نسل کشی، اف! یہ شکست تہذیب   ہائے، انساں کے علوم اور فنوں کی میراث
مٹ گئی فتنہ گروں، خیرہ سروں کے ہاتھوں   دیکھتے دیکھتے اعصار و قروں کی میراث
اب رہا کیا ہے؟ بتا عظمت انساں کے نقیب!   ہم نے چھوڑی تھی جہاں امن و سکوں کی میراث
لے کے کیا جائے گا دنیا سے، بتا جابر وقت!   ساتھ جائے گی تری فطرت دوں کی میراث
دیکھنا یہ ہے کہ اس دور تعیش میں رئیس   کس کو ملتی ہے مرے سوز دروں کی میراث

☆ 4/118۔اے، لوکو کالونی، (نئی آبادی) علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

تصوف اور شریعت (مجدد الف ثانیؒ کے افکار کا مطالعہ): از ڈاکٹر محمد عبد الحق انصاری، مترجم مفتی محمد مشتاق تجاروی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۲۰۸، قیمت: ۸۰/ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی۔۳۰۷ دعوت نگر، ابو الفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کارہائے تجدید و اصلاح کے مطالعے و تجزیے میں اصحاب فکر و نظر کے لیے خاص کشش ہے، تصوف کی ہمہ گیری نے اس کی تعریف اور مقاصد کی تعیین میں کسی ایک جامع تعریف پر اکتفا نہیں کیا جس کی وجہ سے تصوف اور شریعت کے تعلق کو پیچیدہ اور تفصیل طلب سمجھا جاتا رہا، زیر نظر کتاب بھی اسی وضاحت کی ایک کوشش ہے جس میں حضرت مجدد صاحب کے افکار کو اس احساس کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ وہ خود ایک صاحب نسبت صوفی تھے، اصلاح تصوف کے لیے مدۃ العمر کوشاں رہے اور اس راہ میں غیر معمولی عزیمت سے کام لیا، خاص طور پر تزکیہ و احسان میں طریق نبوی ﷺ اور طرز صوفیہ میں انہوں نے اس بنیادی فرق کو واضح کیا جس کی نفی صوفیہ عام طور سے کرتے رہے، نظریہ وحدۃ الوجود کا رد تو ان کی کتاب تصوف کا سب سے نمایاں باب ہے، اہم علمی و نظریاتی مبحث کے علاوہ مسائل تصوف کی نزاکت، سخت احتیاط اور امانت و ایمان داری کی متقاضی ہے، مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے اس تقاضے کو اس حد کمال تک ملحوظ رکھا کہ شکوہ پھر اسی پیچیدگی کا تازہ ہوگیا جس کے رفع و توضیح کی جانب شروع میں اشارہ کیا گیا تھا، اصل کتاب حضرت مجدد کی زندگی اور کارناموں کے بیان سے شروع ہوتی ہے، بعد کے ابواب میں تصوف، شریعت، وحدۃ الشہود عنوانات کے تحت مختلف مسائل میں حضرت مجدد اور عام صوفیہ کے فرق و اختلاف کی نشان دہی کی گئی ہے، حضرت مجدد کی اولیت کا اعتراف جابجا ہے تاہم صوفیائے سابقین کے متعلق یہ تکرار بھی موجود ہے کہ ان کے خیالات، حضرت مجدد سے مختلف نہیں، کشف اور احکام شریعت میں اس کے اثر کے متعلق صاف لکھا گیا کہ یہاں حضرت مجدد اور ابن عربی کے نظریات قریب قریب یکساں ہیں، فاضل مصنف نے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کم کیا ہے

لیکن کشف کے سلسلے میں فرمانِ نبوی ﷺ استفت قلبک کے متعلق یہ کہنا کہ "یہ ایسے ہی موقع کے لیے ہے"، محل نظر ہے، خصوصاً "ہی" کے حرف قطعی کے ساتھ، نبوت و ولایت کی بحث میں کہا گیا کہ "جو نتائج حاصل ہوئے وہ خود حضرت مجدد کو چونکا دینے والے ہوں گے"، حالانکہ نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ اس باب میں "شیخ مجدد .... اپنی فکر کو آخری مرحلے تک نہ پہنچا سکے" یہ تسلیم کرنا بھی محل نظر ہے کہ "ولی .... پر الہامات ہوتے ہیں وہ غیبی آواز سنتا اور ان سے ہم کلام ہوتا ہے" اس دعویٰ کے لیے دلیل کی صراحت ضروری تھی، آخری باب امام ابن تیمیہ کے افکار تصوف کے متعلق ہے، اس سے غالباً دونوں کے خیالات میں یکسانی دکھانا مقصود ہے، کتاب اصلاً انگریزی میں لکھی گئی تھی اس لیے قدرتاً اس میں مستشرقین کے بعض خیالات اور ان کے اعتراضات کی بازگشت موجود ہے، خاتمہ اس امید پر کیا گیا ہے کہ "اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اسلام میں تصوف کے لیے اس کا ایک جائز مقام ہے" اس جملے کا اجمال اب بھی ایک تفصیل کا طالب ہے، ترجمہ سلیس و رواں اور خوب ہے۔

تربیت اولاد کا اسلامی نظام: از جناب سید عبداللہ ناصح علوان سامی، تلخیص، جناب مولانا محمد قمر الزماں الہ آبادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ کتابت و طباعت، مجلد، صفحات: ۵۹۲، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ دار المعارف بی/۲۳۹، وصی آباد، الہ آباد۔

صالح اور مثالی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں نوخیز نسل کی تربیت، کردار سازی اور راہ نمائی سب سے اہم ہے، اسی لیے اسلام نے اس حصے سے غیر معمولی اعتنا کیا، قرآن و حدیث میں کثرت سے اس سلسلے میں واضح احکام دیے گئے جن کی تفصیل و وضاحت کا فریضہ اہل علم و قلم مسلسل انجام دیتے رہے، زیر نظر کتاب بھی اسی ادائے فرض کا ایک حصہ ہے جو شام کے مشہور عالم کی محنت کا ثمرہ ہے، اس مبسوط اور ضخیم کتاب میں بچوں کی نفسیات اور تعلیم و تربیت کے متعلق قریب ہر جزیئے کا استقصا کیا گیا ہے، یہ کہنا درست ہے کہ اپنے موضوع پر اس سے بہتر کتاب اب تک نہیں لکھی گئی، اردو میں اس کا ترجمہ کراچی سے طبع ہوا تھا اب فاضل تلخیص نگار نے اس کو مزید سنوار کر شایع کیا ہے، فاضل گرامی کو اصلاحی ادب سے خاص شغف ہے، ان کی کتاب اقوال سلف کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، یہ کتاب بھی اسی سلسلۂ نافعہ کا گویا حصہ ہے اور اس لائق ہے کہ یہ ہر شخص کے مطالعہ میں رہے۔

غبار کارواں: از جناب مولانا محمد رابع حسنی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۲۳۴، قیمت: ۷۰/روپے، پتہ: عالمی رابطہ ادب اسلامی، ندوۃ العلما، لکھنؤ۔

زندگی، تاریخ اور مذہب و ثقافت سے زبان و ادب کے موثر اور طاقت ور رشتے کو اسلام کی نظر سے دیکھنے اور اس کی کسوٹی پر پرکھنے کی غرض سے قریب ۳۰ مضامین کا یہ مجموعہ، ادب اسلامی کی روح سے آشنا اور ہم کنار کرنے کی پاکیزہ کوشش ہے، فاضل مصنف کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی، سادگی اور موضوع سے براہ راست وابستگی ہے، یہ مجموعہ بھی اسی ادبی تاثیر کی ایک مثال ہے، ادب اور زبان، ادب اسلامی کا تخیل و محرکات، اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات، اسلامی ادب کیوں؟ اور ادب کی طاقت جیسے مضامین اگر ادب کے بارے میں اسلامی نظریے کی توضیح ہیں تو حمد و مناجات، حدیث و ملفوظات، سوانح اور مکتوبات جیسے عنوان کے تحت اسلامی ادب کی تصویر بھی رعنائی میں کم نہیں، بیشتر مضامین، رابطہ ادب اسلامی کی نشستوں کے لیے لکھے گئے اس لیے یہ خیال بھی درست ہے کہ ان تحریروں سے رابطہ کی گرمی عمل کی ایک جھلک ملتی ہے۔

ارمغان مشرق: (منظوم ترجمہ) از جناب عبدالعلیم صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۱۴۰، قیمت: ۸۰/روپے، پتہ: اقبال اکادمی، ۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ، لاہور۔

پیام مشرق اور ارمغان حجاز میں علامہ اقبال کی قریب ۵۵۶ رباعیاں بھی شامل ہیں، فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے کلام اقبال کے اکثر اردو شائقین ان رباعیوں کے کیف و اثر سے محروم رہ جاتے ہیں، زیر نظر منظوم ترجمہ اسی محرومی کے ازالے کی کوشش ہے، فاضل مترجم فارسی زبان کے استاد اور اب وظیفہ یاب ہو کر پاکستان کی ایک دور افتادہ بستی میں قیام پذیر ہیں، اصلاً وہ یوپی کے ضلع سلطان پور کے رہنے والے ہیں، نسبتاً وہ کم نام ہیں مگر اس منظوم ترجمے سے فارسی اور اردو زبان پر ان کی غیر معمولی دسترس اور علامہ اقبال کی فکر اور آہنگ سے مطابقت اور خود ان کی شاعرانہ صلاحیت کا بہترین اظہار ہوا ہے، یہ رباعیاں یقیناً فکر اور فنِ اقبال کی رفعتوں کی شاہد ہیں، ان کا ترجمہ آسان نہیں لیکن اس منظوم اردو ترجمے کو دیکھ کر ان پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے

عقل کہتی ہے اسے ممکن نہیں ہے دیکھنا	ہے نگاہِ شوق لیکن خوگر امید و بیم
طور کا قصہ پرانا ہو نہیں سکتا کبھی	ہر بشر کے دل میں پنہاں ہے تمنائے کلیم

بے شبہہ یہ ترجمہ اقبال اکادمی کی شان دار کارگزاریوں کا خوبصورت آئینہ ہے۔

(ع۔ص)